رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

مومن

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)
چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

"مومن نمبر" دوسرا اڈیشن شایع ہوگیا

دو روپیہ علاوہ محصول

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی بہ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، الوہیت و رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۲۰۶ صفحات، مجلد نو روپیہ لغہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علمِ غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالمِ برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۶۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرتِ خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ورق نہ اُلٹئے پہلے اس خط کو پڑھ لیجئے

(اس پرچہ کے ساتھ ایک مطبوعہ کارڈ آپ کو ملے گا اسکی خانہ پُری کرکے بواپسی ڈاک بھیج دیجئے)

کرمی ۔ تسلیم

آپ کو معلوم ہے کہ کاغذ کی حد درجہ گرانی اور مصارف طباعت و اشاعت کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہم بادل ناخواستہ اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ نگار کے سالانہ چندہ میں (سالنامہ کے زیادہ ضخیم ہوجانے کی وجہ سے) دو روپیہ کا اضافہ کریں۔

اس اضافہ کے معنے یہ ہیں کہ آپ کو تقریباً پونے تین آنے ماہوار زیادہ ادا کرنے پڑیں گے اور یہ رقم غالباً اتنی نہیں کہ آپ اسے برداشت نہ کرسکیں، جبکہ آپ اس سے کہیں زیادہ روز اپنے مشاغل تفریح میں صرف کردیتے ہیں ـــــ لیکن اگر آپ نگار کی دیرینہ خدمات کے پیشِ نظر اتنا ایثار بھی گوارا نہیں کرسکتے تو کم از کم تین پیسہ کی قربانی گوارا فرماکر ایک کارڈ کے ذریعہ سے مطلع فرمادیجئے کہ آپ کو سالنامہ کی ضرورت نہیں ہے اور دو روپیہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں نامنظور ہے (آپ کارڈ بیرنگ بھی بھیج سکتے ہیں)

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے تو نامنظوری کی اطلاع نہ ملنے پر نگار کے سالنامہ کا وی پی آٹھ روپیہ چھ آنہ میں روانہ کیا جائے گا اور اگر دسمبر ۱۹۵۱ء کے بعد کسی اور مہینے میں آپ کا چندہ ختم ہوتا ہے تو دو روپیہ چھ آنہ کا وی پی روانہ ہوگا اور اس یقین کے ساتھ کہ آپ اسے واپس کرکے ہمارا نقصان پسند نہ فرمائیں گے۔

یقیناً یہ امر آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ اُردو اسوقت نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے اور ہر اس شخص سے جو اُردو کی بقا چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ ایثار و قربانی چاہتی ہے، لیکن ہم تو آپ سے صرف دو روپیہ سال کی مدد چاہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے عوض میں دو روپیہ سے کہیں زیادہ قیمتی چیز آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

سالانہ چندہ یا سالنامہ کی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۶ر کی بچت ہوگی

پاکستان کے خریداروں کے نام وی پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا چندہ آٹھ روپیہ یا سالنامہ کی قیمت دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر ذیل کے کسی پتہ پر بھیجکر ہم کو اطلاع دیدیں۔

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۔ ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی

۲۔ ملک محمد دین اینڈ سنز پبلشرس ۱۰ ابل روڈ ۔ لاہور

(نوٹ) آیندہ سالنامہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے پشت صفحہ کا اعلان ملاحظہ فرمائیے۔

منیجر

داہنی طرف صلیبی نشان اس بات کی علامت
ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۰	فہرست مضامین نومبر ۱۹۵۱ء	شمارہ ۵

ملاحظات ---------- ۳
وسط ایشیا کی کلچری ترقی ---- [illegible] الدین احمد ---- ۵
انسان و انسان اعلیٰ ---- مسعود جاوید (بی۔اے) ---- ۱۳
ہماری ادبی تاریخیں ---- سید محمد عقیل ---- ۲۱
اسد اللہ خاں تمام ہوا؟ (ایک سوانحی تنقید) ---- (پروفیسر) حمید احمد خاں ۲۷
عہد حاضر میں حجری دور کا انسان ---- نظیر صدیقی ---- ۳۴
ادب لکاتب والشاعر ---------- ۳۷
باب لاستفسار ---------- ۴۱
کائنات کی عظمت ---------- ۴۴
منظومات ---- قمر اکبرآبادی، منیاں اکبرآبادی، مشیر جھنجھانوی، صفیہ شمیم ---- ۴۵

آئندہ سالنامہ

حسرت نمبر کی اہمیت

دنیائے تغزل میں حسرت موہانی کی انفرادیت کو ہر دبستان شاعری نے تسلیم کیا ہے اور انھیں رئیس المتغزلین کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو، لیکن ان کی شاعری کی وہ کیا خصوصیات ہیں جنھوں نے ہر شاعر و نقاد سے یہ خراج تحسین حاصل کیا، اس کا صحیح اندازہ آپ کو حسرت نمبر کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، جس کی تکمیل میں پاکستان و ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ادیب و نقاد حصہ لے رہے ہیں مثلاً، — مرزا جعفر علی خاں اثر - پروفیسر رشید احمد صدیقی - پروفیسر مجنوں - پروفیسر فراق - پروفیسر احتشام حسین - پروفیسر سرور - پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی - پروفیسر خواجہ احمد فاروقی - خلیل الرحمان اعظمی - اڈیٹر نگار وغیرہ۔

اس سالنامہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ کلام حسرت کا اتنا مکمل انتخاب اس میں شایع کیا جائے گا کہ کلیات حسرت کے مطالعہ سے آپ بالکل بے نیاز ہو جائیں گے۔

اس سالنامہ کو معیاری چیز بنانے کے لئے ضخامت کا کوئی سوال سامنے نہ ہوگا اور غیر خریداران نگار کے لئے اس کی قیمت دو روپیہ سے کم نہ ہوگی، ممکن ہے زیادہ ہو جائے۔

مینجر

ملاحظات

نوابزادہ لیاقت علی خاں کی شہادت

یوں تو ہر انسان کا قتل اپنی جگہ افسوسناک ہوا کرتا ہے، لیکن کسی ایسے فرد کی ہلاکت جس کی ذات کسی قوم یا جماعت کی ملکیت ہو، قوم و جماعت کی ہلاکت ہے ؎

وَلَیسَ سَرِیرَ النَّعشِ مَا تَسمَعُونَہ

وَلَا کُنہُ اصلَابُ قَومٍ تَقَصَّفُ

(یہ جو تم سُن رہے ہو تابوت کی چرچراہٹ نہیں ہے بلکہ قوم کی ریڑھ کی ہڈیاں چٹک رہی ہیں)

نوابزادہ مرحوم ۱۸۹۵ء میں بمقام کرنال پیدا ہوئے اور علیگڈھ، الہ آباد اور آکسفورڈ میں رہکر انھوں نے مدارج تعلیم طے کئے۔ ہندوستان کی تقسیم سے قبل بھی وہ ہمارے یہاں کلیدی مناصب پر فایز رہے اور تقسیم ہند کے بعد تو خیر وہ قاید اعظم کے دست راست تھے ہی۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان ایک جداگانہ سلطنت تو بن گئی تھی لیکن اس کی حیثیت ایک جامۂ تار تار سے زیادہ نہ تھی۔ اور مشکل سے باور کیا جا سکتا تھا کہ وہ آسانی سے منزل استقامت تک پہونچ سکے گی۔ مگر قاید اعظم کی ملک میں غیر معمولی جوش و ولولہ اور کیفیت عزم و یقین پیدا کرکے پاکستان کو ابتدائی منزل تعمیر کی دشوار گزار راہوں سے یہ آسانی گزار لے گئے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مجاہدانہ عزم میں بھی نوابزادہ مرحوم کی شخصیت بڑی عظیم شخصیت ثابت ہوئی۔ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ قاید اعظم اس جہان سے رخصت ہو گئے اور یہ پہلا زبردست صدمہ تھا جو پاکستان کی نوزائیدہ سلطنت کو پہونچا، لیکن نوابزادہ مرحوم کے وجود نے یہ صدمہ بھی ملک کو زیادہ محسوس نہ ہونے دیا اور انھوں نے ان تمام ذمہ داریوں کو جو قاید اعظم نے سنبھال رکھی تھیں اپنے مضبوط شانوں پر لے لیا اور حکومت کا وہ ڈھانچہ جو طیار ہو چکا تھا بگڑنے نہ پایا۔

یہ موقع نہیں کہ نوابزادہ مرحوم کی قایم کی ہوئی پالیسی پر رائے زنی کی جائے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم رکھنا ان کی انتہائی خواہش تھی اور اس خواہش کی تکمیل میں جو موانع پیش آتے تھے ان سے وہ خوش نہ ہوتے تھے اور قوم میں ذہنی، عندال قایم رکھنے کا انھیں بڑا خیال تھا۔

نوابزادۂ مرحوم کے واقعۂ شہادت کے اسباب کیا تھے، ان کا نہ ہمیں صحیح علم ہے، نہ ان کے معلوم کرنے کی ضرورت کیونکہ دُنیا میں اکثر بڑے بڑے کام کرنے والوں کا یہی حشر ہوا ہے اور اس انجام کے بعد جو ردّ عمل ملکوں میں ہوا کرتا ہے وہ ہمیشہ بُرا نہیں ہوا کرتا۔

نوابزادۂ مرحوم کی جگہ خواجہ سر ناظم الدین کا انتخاب متعدد وجوہ کی بنا پر بہت مناسب انتخاب ہوا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کی ہدایت و سرکردگی میں پاکستان امن و سکون کے قیام کو (جو اسلامی تعلیم کا تنہا نصب العین ہے) اولین سیاسی ضرورت قرار دے گا اور اپنی تمام ہمسایہ سلطنتوں سے اس کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔

ایک اور نیا خطرہ

مشرق وسطیٰ کی تاریخ بھی بڑی عجیب تاریخ ہے، ایک طرف وہاں اگر پیغمبروں نے جنم لیا تو دوسری طرف بڑی بڑی خونریزیاں بھی وہاں ہوئیں۔ پھر اب کہ پیغمبر پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں اگر وہاں خونریزیاں ہی خونریزیاں ہوں تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔ مشرق وسطیٰ کی اہمیت زیادہ تر اس لئے ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک بڑی اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور مغرب جو اب تک مشرق پر اپنا اقتدار قایم رکھنے کی طرف سے مایوس نہیں ہوا ہے، اس پر اپنا تسلط ضروری سمجھتا ہے۔

گو مشرق وسطیٰ سے مراد صرف ایشیا کا وہ حصہ ہے جو بحر روم، خلیج فارس اور آبنائے باسفورس کے درمیان واقع ہے، لیکن چونکہ اسکے حدود ایک طرف ایران سے ملتی ہیں اور دوسری طرف مصر سے اس لئے مشرق وسطیٰ کے مسایل سے ایران و مصر کبھی بے تعلق نہیں رہ سکے، اور اسی بنا پر ایران میں پٹرول کو قومی ملکیت بنانے کی تحریک اور مصر میں سویز کے علاقہ سے انگریزوں کا تخلیہ، برطانیہ کے نزدیک مشرق وسطیٰ ہی کے مسئلہ دفاع سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ابھی ایران کا جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ برطانیہ کو مصر سے اُلجھ جانا پڑا اور یہ آویزش حد درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ برطانیہ اس کو تو گوارا کرسکتا ہے کہ وہ ایران کے پٹرول سے ہاتھ دھولے لیکن نہر سویز سے اپنا اقتدار ہٹانے پر وہ شاید کبھی راضی نہ ہوگا۔

۱۹۴۶ء میں برطانیہ نے نہر سویز کے علاقہ سے اپنی فوجیں ہٹالینے کو اصولاً تسلیم کرلیا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ فلسطین کو وہ اپنا فوجی مستقر نہیں بنا سکتا تو اپنی فوجیں وہاں رکھنے کے لئے ایک نئی توجیہ یہ پیش کی کہ مشرق وسطیٰ کے امن وسکون کے لئے انگریزی فوجوں کا وہاں رہنا ضروری ہے مصر کی موجودہ حکومت نحاس پاشا کے ہاتھ میں ہے اور قوم نے ان کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ وہ نہر سویز کے مکمل تخلیہ اور مصر کے ساتھ سوڈان کے الحاق کے حامی تھے اور اب چونکہ حکومت مصر نے ان دونوں مطالبات کی توثیق کردی ہے، اس لئے مصر و برطانیہ کی کشیدگی کا جنگ کی صورت اختیار کرلینا بالکل قرین قیاس ہے۔

برطانیہ کی طرف سے مصر کے ان دونوں مطالبات کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ سوڈان کے مستقبل کا فیصلہ خود اہل سوڈان کے ہاتھ میں ہے اور سویز کے علاقہ میں برطانوی فوجوں کا قیام اس لئے ضروری ہے کہ مشرق وسطیٰ کا دفاع تنہا مصر کے بس کی بات نہیں۔

برطانیہ کے اس طرز عمل کا ردعمل مصر میں یہ ہوا ہے کہ وہاں تمام ملک میں برطانیہ کے خلاف زبردست مظاہرے ہو رہے ہیں اور بعض جگہ یہ اس حد تک پہونچ گئے ہیں کہ برطانیہ کو اور مزید فوج طلب کرنا پڑی ہے۔

حفاظتی کونسل سے کوئی توقع رکھنا بیکار ہے کیونکہ وہ بالکل برطانیہ و امریکہ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے اگر یہ سوزش کم نہ ہوئی تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ و مصر کے درمیان لڑائی چھڑ جائے گی اور پھر یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور یہ آگ پھیل کر وادی نیل سے آگے اور کن کن ملکوں تک پہونچے گی۔

کانگرس کی ذہنی تبدیلی

جواہر لال نہرو نے جب سے صدارت کانگرس کی خدمت قبول کی ہے، کانگرس کی ذہنیت میں بہت نمایاں تبدیلی پیدا ہوچلی ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت مہاسبھا کے لیڈروں کی طرف سے جو جو تقریریں سننے میں آرہی ہیں، وہ ان کے احساس کمتری کے ثبوت میں بہ آسانی پیش کی جاسکتی ہیں۔

جواہر لال نہرو نے اس وقت تک سب سے زیادہ مخالفت فرقہ واری ذہنیت کی ہے اور انھوں نے صاف صاف کہدیا ہے کہ وہ اس مکروہ ذہنیت کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں مہاسبھا کے برہم ہونے کی کیا وجہ ہے، اور وہ کیوں اس ٹوپی کو اپنے سر منڈھ رہی ہے۔

اگر وہ کوئی فرقہ پرست اور رجعت پسند جماعت نہیں ہے تو وہ اس نشانہ کا ہدف اپنے آپ کو کیوں قرار دے اور اگر واقعی اس کی ذہنیت فرقہ وارانہ ہے تو اسے اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور یہ دعویٰ چھوڑ دینا چاہئے کہ اس کا پلیٹ فارم مسلمانوں کے لئے بھی کھلا ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ الکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو اور زیادہ آزاد خیال ثابت کرے، لیکن اس کی یہ کوشش بیکار ہوگی کیونکہ مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ مہاسبھا جس کی بنیاد ہی انسانیت کی تفریق اور متعصبانہ قدامت پرستی پر قایم ہے، کبھی مسلمانوں کی دوست نہیں ہوسکتی اور اس کے نزدیک آزاد حکومت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہندو قوم مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینے، ان کو زبردستی ہندو بنالینے اور ان کے معابد کو مندروں میں تبدیل کردینے کے لئے پوری طرح آزاد ہو اور اس سے کم پر وہ حکومت سے سمجھوتہ کرنے کے لئے طیار نہیں۔ پھر ہمیں حیرت مہاسبھا کے اس Cheek پر نہیں بلکہ حکومت کے اس رواداراند طرز عمل پر ہے جس نے اس جماعت کے وجود کو اس وقت تک برداشت کیا اور اس سے زیادہ تعجب ہوگا اگر آیندہ الکشن کے بعد نئی حکومت نے بھی یہ عنصر ہندوستان میں باقی رہنے دیا۔

وسط ایشیا کی کلچری ترقی

(بہ سلسلۂ ماسبق)

سوویٹ ادب و کلچر کی بین ملیت اس سے پہلے کہ مختلف سوویٹ قوموں کے ادب کی ندیاں ایک بڑی ندی کا دھارا بن کر بہنے لگیں بعض اہم مرحلے طے ہونا بھی ضروری تھے۔ وفاقی جمہوریتوں میں اتحاد پیدا کرنے کا سب سے اہم ذریعہ روسی زبان تھی۔ مختلف قوموں کی ایک وفاقی حکومت بننے کے لئے ایک بین ملی زبان کا ہونا از بس ضروری تھا۔ اور یہ حقیقت دُنیا بھر نے مان لی ہے کہ روسی ادب جمہوریت کی اسپرٹ سے مالا مال ہے

اپنی افشار ادب میں گورکی نے صرف یہی نہیں کیا کہ اُنیسویں صدی کی تنقیدی واقعیت سے کام لیا بلکہ اس نے لوک گیتوں اور عوامی قصوں سے بھی بڑا کام لیا۔ عوام کی اس بے لکھی شاعری سے معیاری ادب پیدا کرنا ہی اس بات کی ضمانت ہو گیا کہ معیاری ادب اور عوامی ادب کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے۔ یہ حقیقت آج سوویٹ کے ہر قومی ادب کی خصوصیت بن گئی ہے

یہ اشارہ اوپر کیا جا چکا ہے کہ روسی ادب میں غیر روسی کردار انقلاب سے پہلے بھی پیش کئے جا رہے تھے، لیکن اُس وقت ایسا ہونا کسی غایت اور مقصد کی بنیاد پر نہ تھا۔ لیکن جب اشتراکیت نے تمام سوویٹ قوموں کے بھائی چارے کو ایک حقیقت بنا دیا تو ان تمام قوموں کے ادب میں موضوع اور تکنیک کے اندر از خود وحدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ پوری سوویٹ یونین کے اندر "قومی ایپک اور کلاسک" کا ایک جشن منایا گیا جس میں ہر علاقے کے لوگوں نے ایک قومی تہوار کی طرح دل کھول کر حصہ لیا۔ آج "ڈیوڈ ساسون" "زنگار" "فرہاد و شیریں" مجنوں اور خسرو محض فارسی یا ارمنی، محض ازبکی یا آذربیجانی نہیں، بلکہ پوری سوویٹ یونین کے قومی کردار بن گئے ہیں

وسط ایشیا کی قوموں کا کلچر دُنیا کے کلچر سے الگ تھلگ نہیں رہا ہے۔ اس میں غیر ملکی جواہر بھی شامل کئے گئے ہیں۔ شیکسپیر، مولیر، بلزاک، ڈکنس فلابیر، لانگ فیلو، مارک ٹوین اور بہت سے یورپی اہلِ قلم کی تصانیف سے دل کھول کر استفادہ کیا جا رہا ہے۔ ازبکستان میں ابرار ہدایت اوف[1] شیکسپیر کے کرداروں کی تعبیر میں یورپ کے ایکٹروں کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ وسط ایشیا کا ادب ان تمام جلیل القدر فنکاروں سے پوری طرح روشناس ہے، اور بالکل اس طرح جانتا ہے جس طرح وہ سعدی، حافظ اور نوائی سے واقف ہے یا جس طرح بیدم قلی اور جلیلی کو جانتا ہے یا جسطرح پشکن، دوستوفسکی، چیخوف اور گورکی سے روشناس ہے — پشکن کے Eugene Onieng کا ترجمہ ایک کے قلم سے ہوا ہے اور "قفقاز کا قیدی" "بنت البحر" کے ترجمے جن میں "جپسی" اور "کپتان کی بیٹی" بھی ہیں۔ اسی طرح لارمانتوف، گوگول، چیخوف، شڈرین، استرافسکی اور گورکی کے مشہور ادب پارے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ تفننی ادب کے سلسلہ میں پلینسکی اور دوبرولیوبان بھی منتقل کر لئے گئے ہیں

اسی کے ساتھ ساتھ اکثر غیر روسی سوویٹ شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے روسی اور دوسری سوویٹ زبانوں میں برابر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس مسئلہ میں گورکی انسٹی ٹیوٹ کا ذکر بہت ضروری ہے جو محض اس غرض کے لئے قایم کیا گیا ہے کہ عام طور پر دُنیا کی زبانوں کے ادب پارے اور خاص طور پر سوویٹ زبانوں کے ادبی کارنامے سوویٹ زبانوں میں منتقل ہوتے رہیں۔ اس طرح ۶۲ سوویٹ زبانوں کا ادب باہم منتقل ہوتا رہتا ہے۔

---

[1] ابرار ہدایتوف پر میرا ایک مضمون رسالہ آجکل میں بسلسلہ "وسط ایشیا کے چند فنکار" شایع ہو چکا ہے

اور غیر ملکی ادبی کارنامے تمام سوویٹ زبانوں میں ترجمے ہوکر ان کو متمول بناتے رہتے ہیں

کلچری ترقی کے ذیل میں ایک اور اہم کام یہ انجام پا رہا ہے کہ تمام سوویٹ قوموں کے قومی ایپک روسی زبان میں منتقل کر لئے گئے ہیں۔ نظامی گنجوی پر بے حد ریسرچ کی گئی اور اس کا کلیات مبسوط مقدمے کے ساتھ شایع کیا گیا ہے، نظامی کی آٹھ سو سال کی یادگار حال میں پوری سوویٹ یونین میں منائی گئی ہے۔ اسی طرح علی شیر نوائی پر ریسرچ کرکے اس کے کلام کے نفیس ایڈیشن نکلے اور پانصد سالہ برسی بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔

مختلف سوویٹ قوموں کے ادب کے ذیل میں یہ کہنا شاید صحیح نہ ہوگا کہ ایک ادب کے کردار دوسرے ادب میں لے لئے جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان تمام زبانوں کے ادب میں جو کردار تخلیق پاتا ہے وہ بین الملی سوویٹ کردار ہوتا ہے اور اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہر سوویٹ قوم کے ادب کی غایت اور اس کے فن کاروں کی تخیل بھی بین ملی چیز بن گئی ہے۔ حاجی نصیر الدین اور پرنس ایگور اسی طرح بین ملی ادبی کردار ہیں جس طرح بعض خالص مشرقی کردار روسی ادب کے کردار بن گئے ہیں (ایسے بعض کرداروں کے نام پہلے دئے جا چکے ہیں) الحاصل سوویٹ روس میں ایک مشترک تولیت اور ایک مشترک کلچر وجود میں آگیا ہے

ترکمان، کازاک اور تاجیک زبانوں میں جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، کوئی کلاسک ادب موجود نہ تھا۔ یعنی ان زبانوں میں نثری ادب مفقود تھا۔ چنانچہ تعلیم عام ہوکر ان قوموں میں افشار پرداز اور اہل قلم پیدا ہوئے تو انھوں نے گورکی کی تصانیف کو اپنا کلاسک قرار دیا، اور وہی ان کے لئے مشعل ہدایت بنا۔ اس بنا پر گورکی کو اگر وسط ایشیا کے نئے ادب کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ البتہ یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ چونکہ ان قوموں کے اہل قلم نے گورکی کا اتباع کیا اس لئے ان کا ادب "قومی اسپرٹ" سے لازماً بیگانہ ہوگا۔ کازاک مصنف مشابت متنبع نے خود نوشت سوانح عمری لکھی تو گورکی کا "میرا بچپن" اور "دنیا کے اندر" اس کے سامنے تھیں۔ کازاک زبان میں اس سے پہلے کوئی کتاب واقعیت نگاری کے اصول پر لکھی ہی نہیں گئی تھی

الغرض، یہ ایک امٹ حقیقت ہے کہ سوویٹ قوموں کے اہل قلم کو انسانیت پرستی، وطنی دوستی اور واقعیت نگاری کی جو تعلیم روسی ادب کے فطرت اور پیروی سے ملی وہ کسی اور ذریعہ سے نہ مل سکتی تھی۔ سب سے بڑا فایدہ ان قوموں کو یہ پہونچا کہ وہ محدود قسم کی قوم پرستی اور روایتی قیود و بند سے چھٹکارا پا گئیں، تعصب اور تنگ نظری کی بلا سے بچ گئیں اور واقعیتی صناعت ادب کی وسیع اور روشن شاہراہ پر قدم زن ہو سکیں

جس طرح سوویٹ اقوام کے ادب کا سہرا گورکی کے سر ہے اس طرح شعری ادب کی رہبری کا فخر مایاکوفسکی کو حاصل ہے۔ ان قوموں کے ادب کو مایاکوفسکی کی شعری روایات نے زندگی کی قوت بخشی۔ وسط ایشیا کے جدید شاعروں نے مایاکوفسکی کے اتباع میں عروض کی اکثر پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اس لئے قدامت پرستوں نے اتنی سخت مخالفت کی کہ کچھ دیر کے لئے تو شعر و ادب کی ترقی رک گئی، لکیر کے فقیر قصیدہ گو شاعر فی الجملہ سماج کے اندر اثر رکھتے تھے اور ان کی مخالفت کارگر تھی۔ لیکن نئی نسل کے شاعر بھی اسی سختی سے اڑے رہے — مایاکوفسکی کی روایات شعری نے ان کے بازوؤں کو قوی تر بنا دیا تھا اس لئے وہ کامیاب ہو کر رہے

خصوصیت کے ساتھ مایاکوفسکی کا اثر غفور غلام، شیخ زادہ اور ملکسوف وغیرہ کے کلام میں زیادہ ملتا ہے۔ لیکن ان شاعروں نے مایاکوفسکی کا اتباع اس کو قتل کرکے نہیں کیا بلکہ اپنے قومی جمالیاتی احساس کو مایاکوفسکی کے رنگ میں بیان کیا ان شعراء کے کلام میں آزاد شدہ قوم کی وطنی آرزوئیں اور نوع انسانی کے دلوں میں قومی اتحاد پر زور اور پر تاثیر طریقے پر پیش ہوا ہے

غفور غلام ازبکستان کا بے حد محبوب شاعر ہے، اور اپنے شاعر سے اس قدر محبت کرنا ازبک عوام کے کلچر کی حد بھی بتا دیتا ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ایک واقعہ کافی سے زیادہ ثبوت ہے:۔

دہلی کی طرح تاشقند بھی دو حصوں پر منقسم ہے۔ نیا تاشقند اور پرانا تاشقند۔ غفور پرانے شہر میں رہتا ہے۔ نئے تاشقند میں اس کی ملاقات ایک روسی شاعر سے ہوتی ہے۔ جب رخصت ہوتے ہیں تو غفور اس روسی شاعر کو اپنے گھر کا پتا بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ "پرانے شہر میں پہونچکر کسی سے بھی پوچھ لینا، وہ تمھیں میرے گھر پہونچا دے گا"۔ تاشقند دس لاکھ کی آبادی کا شہر ہے، لیکن پھر بھی تاشقند کا ہر شہری غفور کا مکان جانتا ہے اور پوچھنے والے کو غفور کے گھر تک پہونچا دینے پر مکلف بھی ہے۔ اس ایک واقعہ سے ایک شاعر کی بے مثال مقبولیت اور ایک قوم کی ادب پرستی اور کلچری بلندی،

دونوں ثابت ہو جاتی ہیں

قومی پیکر ادب اور اس کا اشتراکی وصف

اشتراکی حقیقت نگاری اختیار کرنے کے ساتھ ادب میں نئے اصناف داخل ہونے لازمی تھے اور وسط ایشیا کی مختلف قوموں کے ادب کا شکل و صورت کے اعتبار سے "قومی" ہونا اور وصف نوعیت کے اعتبار سے "اشتراکی" ہونا اب ایک واقعہ اور حقیقت بن گیا ہے ۔ اسٹالین کے اس نظریے کی مزید تشریح یہ ہے کہ سارے فن کاروں کی کوشش یہ رہتی ہے کہ قومی کلاسیکی ادب کی بہترین روایات کے خزانے جن کو قومی فطانت نے صدیوں میں جمع کیا تھا، نئے عہد کے ترقی پسند خیالات کے ساتھ سموئے جائیں۔ اس کوشش کا ماحصل یہ ہے کہ تمام سوویٹ قوموں کا ادب صناعتی ترقی کی اس منزل میں ہے جہاں سے وہ بین ملی یگانگت و اتحاد کا ضامن بن گیا ہے

وسط ایشیا کی پرانی تہذیب بالکل ایرانی رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لئے شاعری کا پرواز بھی ایرانی تھا۔ ہندوستانی شاعری کی طرح ردیف قافیہ وہاں بھی لازمی چیز تھا۔ لیکن اب نئے پیکر اختیار کئے گئے ہیں اور قافئے کی پابندی باعتبار صورت رہ گئی ہے۔ لیکن ان جدتوں یا بدعتوں کے باوجود ہر قوم کا ادب شدت کے ساتھ "قومی" ہے اور مشرقی رنگ و انداز جوں کا توں قایم ہے۔ خیالات و تصورات، اوزان و اصناف، رموز و استعارات سب کچھ مشرقی ہے۔ طویل نظموں کے بیچ بیچ میں حکایتیں اور غزلیں اسی طرح دیجاتی ہیں جیسے مثنوی مولانا روم میں ہیں، اور یہ مشرقی رنگ ہر اعتبار اور ہر جہت سے مقامی اور قومی ہے اور اجنبیت دیکھنے کو نہیں ہے۔ آخر مضمون میں تین غزلیں جو اصل زبان میں میری نظر سے گزری ہیں شامل کی جارہی ہیں۔ ان کو پڑھ کر ان تمام باتوں کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے

وسط ایشیا کی اقتصادی حالت

کسی قوم کی کلچری ترقی کو سمجھنے کے لئے اس کے اقتصادیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ کلچری ترقی کے معنے ہیں کہ معیار زندگی اونچا ہو، اور زندگی کا معیار اونچا ہونا اقتصادی بحالی پر منحصر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ کلچری ترقی کے معنے ہی اقتصادی ترقی کے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد تمام تر مادی حقیقت یعنے اقتصادیات پر قایم ہے، اس کی نظر میں کلچر اور اقتصاد کی ترقی لازم و ملزوم ہے۔ چنانچہ وسط ایشیا کی قوموں نے اگر کلچری ترقی کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں صنعتی ترقی بھی اسی تیزی کے ساتھ ہوئی ہے

وسط ایشیا کے علاقوں میں زار شاہی زمانہ میں کوئی کارخانہ اور فیکٹری نہ تھی۔ سائبیرین ریلوے کی وجہ سے دو چار ورکشاپ قایم کئے گئے تھے جنمیں مشکل سے دو چار ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سوویٹ یونین کی پالیسی یہ ہے کہ پچھڑے علاقے تیز ترقی کریں تاکہ کلچری اعتبار سے ترقی یافتہ علاقوں کے برابر ہو جائیں۔ اس لئے جتنی نئی انڈسٹری قایم ہوئی اس کا بڑا حصہ روس کے ایشیائی علاقوں ہی میں قایم کیا گیا۔ بین اقوامی حالات کا بھی تقاضا یہ تھا کہ سوویٹ انڈسٹری جہاں تک ہو سکے وسیع علاقے میں پھیلا دی جائے۔ کیونکہ جنگ کی حالت میں تنگ کارخانے آسانی سے برباد کئے جا سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ سوویٹ طاقت کو فوجی اعتبار سے اپنے دونوں پہلو سنبھالنا ضروری تھے۔ مشرق میں جاپان کا خطرہ اور مغرب میں جرمنی حملہ کا اندیشہ۔ اس بناء پر سرخ فوج دو جداگانہ حصوں میں منظم کی گئی۔ اور ہر حصہ کے لئے پوری جنگی صنعت اسی علاقے میں قایم کرنا ضروری ہو گیا تاکہ فوجی سپلائی اور رسد رسانی کے انتظامات فوج کے ہر حصہ کے لئے علاحدہ علاحدہ رہیں ـــــ لہذا مشرقی سرخ فوج کی ضرورت کی ساری جنگی انڈسٹری اسی علاقہ میں قایم ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں مغربی روس کی انڈسٹری کو بھی مشرقی علاقے میں منتقل کرنا پڑا تھا۔ پھر ساری سوویٹ یونین کے لئے روئی کی سپلائی وسط ایشیا کا علاقہ فراہم کرتا ہے۔ اس لئے کپڑے کی ساری صنعت اور اُن خام پیداواروں کی صنعتیں جو اس علاقے میں پیدا ہوتی ہیں، اس علاقہ میں قایم ہوئیں۔ کاشت کو اتنی ترقی دی گئی ہے کہ ریگستان مرغزار بن گیا ہے۔ ایک بڑی نہر نکال کر فرہاد کے نام پر ایک بجلی پیدا کرنے کا زبردست اسٹیشن بنایا گیا ہے اور فی الواقعہ بے ستون کو کاٹ کر یہ نہر نکالی گئی ہے۔ اس ذکر میں یہ مکالمہ یقیناً دلچسپ ہے کہ ۱۹۴۵ء میں اکیلے ازبکستان کی صنعتی پیداوار اُس سال کی افغانستان، ایران اور ترکی کی مجموعی پیداوار سے زیادہ تھی، حالانکہ ازبکستان کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے اور ان تینوں ملکوں کی ساڑھے چار کروڑ۔ یہ حقیقت ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہئے کہ سوویٹ یونین کے ایک علاقے میں جو حالات نظر آئیں گے وہی کم و بیش دوسرے علاقوں میں بھی دکھائی

دیں گے۔ ظاہر ہے کہ صنعتی پیداوار سائنسی ترقی کی محتاج ہے، اور سائنس نے جتنی ترقی سوویٹ روس میں کی ہے، اس کے بیان کے لئے ایک مبسوط کتاب بھی کافی نہ ہوگی

زمانہ جنگ کا ادب

کثیر المِلّی سوویٹ کلچر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا کہ نازی جرمنی نے حملہ کر دیا۔ بہت سے اہلِ فن اور صناعوں نے مطالعہ کے کمروں کو مورچے کی خندقوں سے بدل لیا۔ اکثر لکھنے والے پہلی مرتبہ اخباری نامہ نگاروں کی حیثیت سے جنگی محاذوں پر پہونچے اور جو اہلِ قلم ادبی محاذ پر ہی رہے انھوں نے اسٹالین کی جولائی ۱۹۴۱ء والی اپیل کی تعمیل میں وطنی جہاد کا وعظ اور ناپاک دشمن سے تنفر کی تلقین شروع کر دی۔ نثر نگار واقعاتی اسکیچوں اور "رپورتاج" کی شکل میں سرخ فوج کے امٹ کارنامے بیان کرنے لگے، مورچے کے پیچھے جو مرد، عورت، بوڑھے بچے جنگی خدمات میں لگے تھے ان کو زندۂ جاوید بنانے لگے۔ اُسوقت کے سوویٹ ادب میں بلکہ تمام وسطی ایشیا کے ادب میں دشمن دشمنی، رسد کی روز افزوں تنظیم اور مورچوں پر جانبازی اور سورمائی کے زندہ مرقعے نظر آتے ہیں۔ کثیر المِلّی سوویٹ شہریوں کا غیر محدود حوصلہ اور وطنی محبت کے وہ مناظر سامنے آتے ہیں، جہاں شکست مکروہ ہوتی اور موت عزیز ہو جاتی ہے

ایک نہایت معمولی اور چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس کی تہ میں بہت بڑی اہمیت چھپی ہوئی ہے۔ ایک سرخ سپاہی اپنی خندق سے دشمن کے بڑھتے ہوئے ٹینک پر ہاتھ سے گولا پھینکتا ہے، وہ نشانہ اتنا غلط ٹھہرتا ہے کہ پھینکنے والے کو ذلت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے ساتھی سمجھتے ہوں گے کہ مجھ پر خوف غالب ہو گیا تھا جب ہی تو نشانہ اتنا غلط پڑا! اب اس سرخ سپاہی نے اپنے اوپر لازم کر لیا کہ کوئی ایسا عمل کرے کہ ساتھیوں نے اسے ڈرپوک سمجھ بھی لیا ہو تو اس کا ازالہ ہو جائے۔ چنانچہ دشمن کا جو دوسرا ٹینک اس کی سمت میں آ رہا ہے، وہ سپاہی اس پر گولا نہیں پھینکتا اور بڑھتا آنے دیتا ہے۔ وہ ٹینک بڑھتا آتا ہے یہاں تک کہ اس خندق کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ مگر وہ سرخ سپاہی اب بھی اس پر گولا پھینک کر تباہ نہیں کرتا۔ جب وہ ٹینک اس کے اوپر سے گزر کر کچھ فاصلے پر پہونچتا ہے تو یہ سپاہی خندق سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا اور پھر گولا مار کر اس ٹینک کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت اس سپاہی کے عمل میں نہیں بلکہ اس کے احساس میں ہے

دورانِ جنگ کے سوویٹ ادب میں ایسے بے شمار کردار تخلیق ہوئے جس سے یہ ادب پہلے سے روشناس نہ تھا۔ عبداللہ قہار نے "فچکا، عزی" کی سوانح عمری لکھی جو ایک فوجی آدمی تھا۔ اس سوانح عمری کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف اپنے ہیرو کے داخلی کردار کے سلسلہ میں یہ بتاتا ہے کہ اس ہیرو کے سرفروشانہ اور جانبازانہ کارناموں کے اندر کونسی اسپرٹ کام کر رہی تھی، اس کی اصل و بنیاد کیا تھی۔

جنگ سے پہلے سوویٹ قوموں کے ادب میں جس لازوال قومی بھائی چارے کا اظہار ہو رہا تھا، وہ جنگ کے زمانہ میں زیادہ گہرا اور زیادہ مخلصانہ ہو گیا تھا۔ ہر قوم کے ادب نے صرف اپنی قوم ہی کے ہیرو اور کردار پیدا نہیں کئے، بلکہ دوسری سوویٹ قوموں کے ہیرو بھی تخلیق کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرخ فوج کے ہیرو تخلیق کرنے کے عمل نے تمام قوموں کے ادب کی ندیوں کو ایک بڑے دریا کا دھارا بنا دیا۔ ادیب شاعر شیخزادہ فاشی درندوں کے ہاتھوں یورپی قوموں کی تباہی دیکھتا ہے تو تڑپ کر چیخ اٹھتا ہے:-

"جو صناعتی اور کلچری جواہر صدیوں میں جمع ہو پائے تھے وہ آناً فاناً خاک سیاہ کر دئے گئے اور ان ایوانوں میں اُلو بول رہا ہے! یورپ! آتشزدہ جنگل یورپ! لشکر زدہ زراعت یورپ! آج یورپ کی زمین زمین نہیں، ٹینکوں کے غار ہیں اور بس! آج یوروپ کی ہوا زہریلی ہے اور زہر خوردہ لاشوں سے پٹا پڑا ہے! آج یورپ کے شہروں کے بازار اجاڑ اور مکان بے سقف و در ہیں! مکانوں کے تہ خانوں میں انسانی کھوپڑیوں کے خزانے بھرے ہیں! آج یورپ کی دوشیزہ اپنے محبوب کے دیدار سے محروم ہے! آج یورپ کے بچے اپنے بوڑھے ماں باپ کے انتظار میں بلک رہے ہیں! یورپ، یورپ!" — اس پوری نظم میں بین قومیت اور انسانیت پرستی کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ فرانس، پولینڈ، آسٹریا، اور چیکوسلواکیا کے محب وطن شاعر اپنے وطن کی تباہی کا نوحہ اس نظم سے بہتر کیا لکھتے؟

کلچری نمائشیں

سوویٹ آئین نے رنگ و نسل کا فرق جرم قرار دیدیا اور کلچری برابری کے لئے سوویٹ حکومت نے بجٹ ایسے بنائے اور انڈسٹری کو اس طرح مرتب کیا کہ آئین اور پالیسی پوری طرح کامیاب ہوں۔ مگر ان تحفظات کو بھی کافی نہیں سمجھا گیا۔

یہ اتحاد و مساوات عملاً زندہ و ذی حیات نظر آنا چاہئے! چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ماسکو میں فن و صناعت کی ایک نمائش کی گئی اور اسے "صناعتی عشرہ" نام دیا گیا۔ پہلی کوشش کامیاب ہوگئی تو پھر ایسے میلوں کو مستقل کر دیا اور ایک ادارہ بنا دیا گیا۔ ہر سال چند سوویٹ قوموں کو دعوت دی جاتی اور سال بھر پہلے دی جاتی ہے۔ جن جمہوریتوں کو مدعو کیا جاتا ہے وہ اپنے یہاں ایک "کلچری اولمپیاد" کا ہفتہ مناتی ہیں اس ہفتے میں جو ادارے کامیاب ہوتے اور جو صناع امتیاز حاصل کرتے ہیں، ان کو ماسکو کے میلے کے لئے چن لیا جاتا ہے۔ تھیٹر اور اوپرا کمپنیاں منتخب ہوتی اور پھر ان کے ایکٹر اور گائک چنے جاتے ہیں۔ ان امتحانوں اور تیاریوں میں سیکڑوں نئے جوہر قابل منظر عام پر آجاتے ہیں، فن و صناعت کو بہمیز لگ جاتی اور کام کا ولولہ ابھر آتا ہے۔ ساری قوم کی توجہ فن و صناعت پر لگ جاتی ہے، اور جب ماسکو کے "عشرے" منائے جاتے ہیں تو وہ ساری سوویٹ قوم کا مرکز توجہ بن جاتے ہیں

آزمایشی یا انتخابی ہفتے کے لئے مہینوں پہلے سے قومی اخبار اور رسالوں میں مستند اہل فن اور کلانکاروں کے مضامین نکلتے اور بحثیں ہوتی ہیں اسی طرح ماسکو کے "عشرے" سے پہلے اور بعد میں ماسکو کے سارے اخبار انھیں بحثوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

ماسکو کے عشرے کے لئے جو جمہوریتیں مدعو کی جاتی ہیں ان کے فن کی نمائش کے لئے پہلے سے ماسکو کے تھیٹر نامزد ہو جاتے ہیں اور ان تھیٹروں کی گیلریوں میں وہ جمہوریتیں اپنی قومی نقاشی، فلم سازی اور دستکاریوں کی نمائش کرتی ہیں۔ تھیٹروں میں ڈراما، پلے اور ناچ گانے کی نمائش ہوتی ہے۔ اور عشرہ ختم ہونے کے دن اس قوم کی تمام کمپنیاں اور طائفے ایک مشترک پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس دن سوویٹ یونین کے ارباب حل و عقد بھی ضرور شرکت کرتے ہیں۔ پھر تمام مدعو جمہوریتوں کے صناع اور کلانکاروں کے اعزاز میں کرملن میں حکومت کی طرف سے ایک جشن ترتیب دیا جاتا ہے اور کامیاب کمپنیوں اور صناعوں کو اعزاز و خطاب دئے جاتے ہیں

یہ ادارہ حقیقت میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا بھر میں نرالا کلچری ادارہ ہے اور سوویٹ فن و صناعت کی ایک کثیر الملی یونیورسٹی کا کام دے رہا ہے۔ ان میلوں نے نہ صرف سوویٹ کلچر کی ترقی کی رفتار کو بہت تیز کر دیا ہے بلکہ قومی بھائی چارہ اور باہمی افہام و تفہیم میں بے اندازہ امداد دی اور آپس کی محبت و احترام کو زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔ اس ادارے اس طرح وجود میں آجانے سے ایک نہایت اہم فایدہ یہ ہوا کہ "سوویٹ صناعت" کی روایات بن گئیں

۱۹۳۰ء کی پہلی نمائش میں چودہ جمہوریتوں نے حصہ لیا تھا۔ اور ۱۹۳۵ء میں جب اس کلچری میلے کو مستقل بنا دیا گیا تو ۱۹۴۰ء تک ہر سال یہ "عشرے" منائے جاتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں صرف کازکستانی جمہوریہ کے تین سو کلاکاروں نے شرکت کی تھی

نقاشی و صنم تراشی مجھے افسوس ہے کہ اس موضوع کے متعلق کچھ تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن اپنے عمومی مطالعے کی بنا پر جانتا ہوں کہ سوویٹ نظام میں کلچری ترقی کا کوئی شعبہ نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اس لئے وہاں جو کچھ ہو رہا ہے "پلانوں" کی تعمیر میں ہو رہا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس پر کہا جا سکے کہ کم توجہ دی گئی ہے۔ سوویٹ سینما کی ترقی اور کمال کو سوویٹ نظام کے مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں بمبئی اور کلکتہ میں سوویٹ فلموں کے میلے لگے تھے اور ان کی کامیابی سوویٹ صناعت کی ترقی کی دلیل ہے۔ پھر یہ حقیقت کہ سوویٹ روس میں جب کھیل کود کے اولمپیاد ہوتے ہیں تو ان میں سوویٹ شہری لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں اک مختصر سا حوالہ ایک مضمون میں صنم ساز جراسیموف کے متعلق دے چکا ہوں جو تعلیم کے لحاظ سے سائنسداں اور فن کے اعتبار سے پیکر ساز ہے۔ اس صناع کا کمال اس حقیقت میں ہے کہ اس نے قدیم شخصیتوں کے، جیسے امیر تیمور وغیرہ کی جو چہرے اور مجسمے بنائے ہیں وہ اس کریکٹر کو حرف بحرف پیش کرتے ہیں جو تاریخ کی کتابیں ان ہستیوں میں منسوب کرتی ہیں

رقص و موسیقی سوویٹ شعر و ادب میں جو ولولہ کار نظر آتا ہے، رقص و موسیقی اور ایکٹری میں بھی وہی چیز نظر آتی ہے، ۱۹۴۴ء میں وسط ایشیائی موسیقی و رقص کا میلہ تاشقند میں لگتا تھا۔ یہ جنگ کا سال تھا مگر اس میلہ میں نو سو استاد گویوں اور رقاصوں نے حصہ لیا تھا اس جشن نغمہ و موسیقی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وسط ایشیا کے لوگوں کی جنگی مصروفیتیں بھی انھیں کلچری ترقی سے باز نہ رکھ سکیں۔ اس میلے میں کازکستان نے اپنی مشہور موسیقی نواز باسطوفا کو بھیجا تھا۔ ازبکستان سے مشہور عالم حلیمہ لقیہ دفا[1]، تمارہ خانم[2]، ترغون بائفا اور لیقوبوف آئے تھے۔

---

[1] و [2] ان دو باکمال رقاصہ و مغنیہ کے حالات پر تفصیلی مضمون آجکل کے دور اول میں شایع کرا چکا ہوں۔

——— الغرض ہر وفاقی جمہوریہ نے اپنے جوہر قابل بھیج کر اس جشن رنگ و راگش کو کامیاب بنایا تھا

ترکمان موسیقی طرازوں اور سنگیت کاروں نے اعلےٰ پائے کی تخلیقیں کی ہیں۔ قلیان کاروپرا "آبادان" اور اسپوسنی کوف کا روپرا "شاہ صنم و غریب" اور قلیان و دیگر ترکمان کلاکاروں کی مشترک کوشش کا نتیجہ "سلام اسٹالین" کی عالیشان نمایشیں ہو چکی ہیں

سوویٹ مصنفین کی یونین ماسکو میں پوری سوویٹ یونین کے شاعروں اور اہل قلم کی یونین کا ایک مرکز ہے جس کی شاخیں تمام وفاقی جمہوریتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ماسکو کا مرکز یا تو دعوت نامے بھیج کر وفاقی جمہوریتوں کے ادیبوں کو بلاتا اور اس جمہوریہ کے نام سے ایک "شام" منعقد کی جاتی ہے یا سوویٹ اور غیر سوویٹ صناع جب ماسکو آتے ہیں تو ان کے اعزاز میں "شام" کے یہ اجتماع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس ادبی کلب اور مرکز کی یہ "شامیں" کثرت سے منعقد ہوتی اور اب ایک مستقل ادارہ بن گئی اور قومی بھائی چارے کی پالیسی کا عملی پہلو ہیں

چنانچہ ۱۹۴۴ء کی سردیوں میں ماسکو کی سڑکوں پر تا مرئے رنگ کی صورتیں عام دیکھی جا رہی تھیں، کیونکہ سوویٹ مصنفین کے کلب نے روشن منظر ازبکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو مہمان بلایا تھا۔ چنانچہ اس "شام" پلیٹ فارم پر بہت سے بیلوروسی، یوکرینی، روسی، لیتھونیا اور یوگرینیا کے ادیب و شاعر بیٹھے تھے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا

سب سے پہلے حمید علیم جان، ازبک مصنفین کی یونین کے سکریٹری نے تقریر کی اور مشہور ازبک مورخ شرف الدین علی یزدی قدیم شاعر کا شعری لیاقت لطفی اور علی شیر نوائی کے حوالوں سے بتایا کہ مشرقی ادب میں ازبک ادب کس قدر زیادہ متمول ہے اور یہ کہ زمانۂ تاریخ میں اس نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے اور آج کس طرح اپنی قومی و کلاسکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سوویٹ ادب کے بڑھتے دھارے میں مل کر بہہ رہا ہے۔ اس نے اس حقیقت پر خوشی ظاہر کی کہ موجودہ ازبک شعراء اور ادیبوں کے نام جیسے غفور غلام، شیخزادہ، الیغوں اور آقائے شعراء اختر و ایبک سوویٹ یونین کے بچے بچے کو معلوم ہیں

حمید کی تقریر کے بعد ازبک شاعروں نے اپنی نظمیں اور ان کا روسی ترجمہ سنایا۔ یہ ادبی پروگرام نوائی کی مثنوی، فرہاد و شیریں کے چند شعر اور پھر ازبک ایپک "روشن" کا کچھ حصہ سنانے پر ختم ہوا۔ اس پرانے ایپک کے اشعار جو سنائے گئے ان میں بازار کا بیان تھا اور ادبی اظہار کی قدرت، تخیل کے تمول بیان کی شگفتگی اور نازک مزاجی رنگ کا نمونہ ہیں۔ بازار کا یہ بیان دنیا کے ادب پاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے

اس شام کا باقی پروگرام رقص و موسیقی اور نغمہ طرازی پر مشتمل تھا۔ ازبک رقص ہندوستانی ناچ کی طرح زیادہ تر ہاتھوں کے حرکات اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ یا اوپر کے حصۂ جسم کی حرکات پر مشتمل ہے۔ رقاصہ کے بازوؤں اور کلائیوں کی حرکات میں ایک وقت اگر سانپ کی لہری چال نظر آتی ہے تو کبھی شہپروں کے آمادۂ پرواز ہونے کا نقشہ پیش ہو جاتا ہے۔ کسی وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کپڑے پر بخیہ کیا جا رہا ہے تو دوسرے وقت روئی کے کپڑے پھٹنے کی کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ رقص کرنے والی کے خدوخال بہت زیادہ معنی آفرینی ہوتے ہیں ——— ازبک رقص کا کمال یہ ہے کہ رقاصہ کے چہرے کے نقوش کبھی خم محراب کی شعریت کا اشارہ کرتے ہیں اور کبھی نشۂ شباب کا جادو محسوس ہونے لگتے ہیں

شان و جمال کی تصویر، رقاصہ مکرم ترعوں بائیفا نے جب اپنے سفید ریشمی کرتے کی دراز آستین کو دانتوں میں دبا کر بساط رقص پر پیر ناچنا شروع کیا تو لوگ وقت کا شمار بھول گئے۔ انداز رقص میں اس کے مسکرا دینے سے تماشائیوں کو زندگی کی کلفتیں یاد نہ رہیں۔ اور جب اس نے ناچتے ناچتے ایک پاؤں کے پنجے پر پھر کیاں لیں تو لوگوں کو چکر آنے لگے تھے

حلیمہ لیفید وفا، سوویٹ یونین کے "صناع عوام" کے معزز خطاب سے سرفراز ہے، اور مشہور ہے کہ وہ عورت کے نہیں بلکہ بلبل کے گلے سے گاتی ہے گانے میں اس کی آواز کھنکنے لگتی ہے۔ ایک نقاد نے لکھا ہے کہ وہ جب گاتی ہے تو کانچ کی طرح نازک معلوم ہوتی ہے اور اس کے گانے میں ایک غیر معمولی جرأت و بے تکلفی ہے ——— حلیمہ نہ صرف سوویٹ یونین کی متعدد زبانیں جانتی ہے بلکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی گاتی ہے اور اس کا یہ گانا خود اہل زبان کے بولنے اور گانے والوں کی طرح مکمل ہوتا ہے۔ جتنی وہ باکمال گانے والی ہے اتنی ہی شوخ و اداطراز بھی ہے۔ یورپ کے مختلف پایہ تختوں میں نمایش فن کر کے داد تحسین حاصل کر چکی ہے

اس کلچری اجتماع میں جمبول زابر بھی شریک تھا، سوویٹ یونین کے گوشے گوشے میں جس کا احترام کیا جاتا ہے
"کلچری عشروں" کی تفصیلات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے

وسط ایشیا کے علمی ادارے

سوویٹ روس کے جامعہ کی شاخیں ہر وفاقی جمہوریت کے مرکز میں قایم ہیں جہاں ہر شعبے کی تحقیق و تلاش برابر ہوتی رہتی ہے۔ اس پورے علاقے کی علمی و کلچری حرکت و عمل اندازہ کرنے کے لئے صرف ازبکستان کا ذکر کافی ہوگا ——— اس لئے کہ سوویٹ یونین میں جو کام ایک علاقے میں ہو رہا ہے وہ باقی حصوں میں اسی پیمانہ پر جاری رہتا ہے۔ ازبکستان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز ڈاکٹر باباجان نیاز محمدوف کی ہستی ہے۔ اپنی مصروفیت کے اعتبار سے نیاز محمدوف، ازبکستان کے "زبان و خیال" کے انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقاتی کام کرتا اور پہلا ماہر لسانیات ہے۔ قومی لحاظ سے وہ تاجیک نسل سے ہے جہاں انقلاب سے پہلے کوئی تحریری زبان بھی نہ تھی۔ نیاز محمدوف نے اسی تاجیک زبان کے صرف و نحو مرتب کئے ہیں۔ وہ خود ایک غریب موچی کا لڑکا ہے اور اگر اس کا باپ بہت بڑا دولتمند بھی ہوتا تب بھی نیاز محمدوف کو وہ نہ بنا سکتا جو اسے سوویٹ نظام نے بنا دیا ہے

۱۹۴۵ء میں میرا ایک مضمون علیگڈھ کے رسالۂ مصنف میں "ازبکستان میں علمی سرگرمیاں" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں میں نے وہاں کے متعدد علمی و کلچری اداروں کے حالات بہم پہونچائے ہیں۔ اس لئے اس جگہ صرف ان کا حوالہ کافی سمجھتا ہوں۔ سوویٹ یونین کے ادارۂ شرقیات کی تاشقندی شاخ نے نظامی گنجوی کے فن و کلام پر پوری تحقیق و تدقیق کر کے اس کا کلیات ایک بسیط مقدمے کے ساتھ اصل اور روسی ترجمے کی صورت میں شایع کیا ہے۔ تاشقند میں ایک اور ادارہ "لسانی تحقیق" کے لئے مخصوص ہے۔ اس ادارے نے ملا علی شیر نوائی کے علم و فضل اور شعر و ادب پر تحقیق کی ہے، اس کی ایک سوانح عمری مرتب کی ہے اور اس کے کلیات کا ترجمہ روسی زبان میں کرایا ہے۔ تاشقندی شاخ جامعہ علوم نے ایک مشرقی مخطوطات کا کتب خانہ بھی فراہم کیا ہے جس میں پچھتر ہزار قلمی نسخے ہیں اور دنیا میں اس قسم کا سب سے زیادہ عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ قلمی نسخوں کے علاوہ پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں ایسی ہیں جو قلمی مسودوں سے بھی زیادہ نادر ہیں۔ وہاں ایک اور ادارہ ہے جو سوویٹ یونین کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ازبکستانی کمیٹی کہلاتا ہے۔ اس ادارے نے بہت سی اہم تاریخی تحقیقات مکمل کی ہیں جن میں گور امیر یعنی امیر تیمور کے مقبرہ اور شہزادۂ الغ بیگ کی رصدگاہ، اکثر مقبروں اور مساجد کا کھوج لگایا، مرمت کرائی یا تعمیر ثانی کی ہے۔ قاری نیازوف جو اس ادارے کا صدر بھی ہے، رصدگاہ الغ بیگ اور اس کی زیچ پر سند مانا جاتا ہے۔ ایک اور ادارہ "انسٹی ٹیوٹ آف میٹریل کلچر" کے نام سے قایم ہے جس نے حال ہی میں دریائے سیر کے کنارے شہر خوارزم کے پانچ ہزار سال پرانے تمدن کے آثار نکالے ہیں اور کام جاری ہے

اسی طرح دوسری جمہوریتوں میں بھی یہ تمام کام ہو رہے ہیں۔ ترکمانیہ میں شیخ جمالت الحق والدین کا مزار از سر نو تعمیر کرایا گیا مگر بالکل پرانے نقشے پر۔ یہ مقبرہ شیخ کے لڑکے محمد نے ۱۶۵۵ء کے قریب تعمیر کرایا تھا اور ماہرین کے خیال میں ایک نہایت اہم تعمیری نمونہ ہے۔ مرو میں سلطان سنجر کا مقبرہ بھی ایک قدیم عمارت ہے جس کی صناعی بے مثال سمجھی جاتی ہے۔ ایک اور عمارت طائرہ بیگ خانم کا مقبرہ ہے۔ اسے امیر تیمور کی بیگم بتایا جاتا ہے ان سب کی مرمت یا تعمیر ثانی ہوئی ہے۔ تشتر آباد، سرائے اور مارسی کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ یہاں ایک قدیم شہر کے آثار نکالے جا رہے ہیں جسکے متعلق خیال ہے کہ گیارھویں صدی میں آباد تھا

۱۹۴۴ء کے مجلہ ہندوستانی میں میرا ایک اور مضمون شایع ہوا تھا جس کا عنوان ہے "وسط ایشیا کی قوموں کا سوویٹ ادب" ——— طوالت کے خیال سے مزید نمونے شامل نہیں کر رہا ہوں مگر آخر میں تین شاعروں کی غزلیں اصل زبان میں دیجاتی ہیں جو ایک ہی ردیف قافئے میں کہی گئی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان غزلوں میں طرز و تکنیک اور "قومی پیکر و اشتراکی وصف" کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ لاہوتی (ابوالقاسم) اصلاً ایرانی ہے اور اپنے ترقی پسندانہ فکر و خیالی کی بناء پر ترک وطن پر مجبور ہوا۔ تاجکستانی وطنیت اختیار کی اور اب وہاں کا وزیر تعلیم ہے

نوشم بہ شادمانیِ آں دم شراب سرخ — کز شوقِ انقلاب دمد آفتاب سرخ
نازم بہ آں زماں کہ بہ نیروے تیغ (ہاپا) و داس (ہتوڑا) — دہقاں نہد بہ گردنِ سلطاں طناب سرخ

قربانِ آں وے کہ زخونِ تو نگراں،
درخونِ شیخ و شحنہ وشہ واجب است غسل،
مرد آں بود کہ رقص نماید بخونِ خویش

عینی :- در آتش ستم جگرم شد کباب سرخ
بر انقلاب روے مرا سرخ کے کند
عینی بیک غزل تواں شرح حال کرد

فطرت :- آفاق را گرفتہ سراسر سحاب سرخ
در خاک و خوں فتادنِ بنیانِ جور و ظلم
اے چشم غیر خوردہ بیں انقلاب را
اصحاب ثروت ایکہ جہاں را بخوں زدید
ہرگز مگو کہ شیخ شود اہل انقلاب
ممنونِ دست ساقیِ کوثر نمی شوم
فطرت مخور فریبِ سیہ طینتانِ زہد

دریائے انقلاب شود پُر حباب سرخ
در شرعِ انقلاب بہ نقشِ کتاب سرخ
در بزمِ انقلاب بہ بانگِ رباب سرخ
از خونِ مستبد قدحے دہ شراب سرخ
از انقلاب سرخ دمد آفتاب سرخ
باید بہ انقلاب نوشتن کتاب سرخ
گویا زمانہ بستہ بہ گردن طناب سرخ
تفسیر آیتے ست زام الکتاب سرخ
صد بحر خوں بروں جہد از ایں حباب سرخ
حاضر شوید ایکہ یوم الحساب سرخ
باور کمن کہ ہست بعالم عذاب سرخ
از خونِ ظالماں نہ دہد گر شراب سرخ
ہر چند بستہ اند بعارض نقاب سرخ

لطیف الدین احمد

"نگار" کے پرانے متفرق پرچے

سنہ ۳۱ء = جنوری (فراست التحریر) عہ ر۔ جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ اکتوبر ۱۲ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔

سنہ ۳۲ء = فروری ۱۲ ر۔ مئی ۱۲ ر۔ جولائی ۱۲ ر۔ ستمبر ۱۲ ر۔

سنہ ۳۷ء = جنوری، فروری (اصحاب کہف) عہ ر۔ مارچ ۸ ر۔ مئی ۱۲ ر۔ جون ۸ ر۔ جولائی ۱۲ ر۔ اگست ۱۲ ر۔

سنہ ۳۸ء = جنوری (تاریخ اسلامی ہند) ۱۲ ر۔ فروری ۱۲ ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی تا دسمبر فی کاپی ۸ ر

سنہ ۳۹ء = جنوری (مصحفی نمبر) عہ ر۔ فروری ۸ ر۔ مارچ ۸ ر۔ اپریل ۸ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔

سنہ ۴۰ء = فروری ۸ ر۔ مارچ ۸ ر۔ اپریل ۸ ر۔ مئی ۸ ر۔ اگست ۸ ر ستمبر ۸ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔

جون تا دسمبر فی کاپی ۸ ر

سنہ ۴۲ء = مارچ ۱۲ ر۔ اپریل ۸ ر۔ مئی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر ۸ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔

سنہ ۴۵ء = اپریل ۱۲ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر ۸ ر۔ اکتوبر ۱۲ ر۔ نومبر ۱۲ ر۔

سنہ ۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) عہ ر۔ اپریل تا اگست مسلسل فی کاپی ۸ ر ستمبر ۱۲ ر۔ اکتوبر ۱۲ ر۔ نومبر عہ ر

سنہ ۴۷ء = جنوری (ماجد و لین نمبر) عہ ر۔ مارچ ۱۲ ر۔ اگست ۱۲ ر۔ ستمبر ۸ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ دسمبر عہ ر

سنہ ۴۸ء = جنوری، فروری (پاکستان نمبر) ۸ ر۔ مارچ ۱۲ ر۔ مئی ۱۲ ر۔ جون ۸ ر۔ جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ نومبر ۱۲ و دسمبر ۸ ر

سنہ ۴۹ء = جنوری، فروری (افسانہ نمبر) عہ ر مارچ تا جولائی مسلسل فی کاپی ۸ ر

سنہ ۵۰ء = جنوری، فروری (تنقید نمبر) عہ ر۔ مارچ ۱۲ ر۔ اپریل ۸ ر۔ مئی ۱۲ ر۔ جون ۸ ر۔ جولائی ۸ ر۔ اکتوبر عہ ر۔ نومبر عہ ر۔ دسمبر ۱۲ ر

منیجر نگار لکھنؤ

انسان وانسانِ اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصّہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

فرزان — توبہ! — وہی پرانے قصے! — بدطینت دوست! تمہاری فطرت کا ایک کمزور پہلو ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ تم بہت جلد فریب کھا جاتے ہو۔ تم انسان کو خود اسی کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ تم نے اس کی بابت جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ اسے اپنی سب سے بڑی تعریف سمجھے گا۔ اُسے خود کو بہادر و بد سمجھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں — وہ صرف بزدل ہے۔ اُسے تم ظالم۔ بیرحم۔ قاتل۔ قزاق۔ تہدید پسند کہہ کر پکارا تو وہ تمہاری پرستش کرے گا اور اپنی رگوں میں قدیم "بحری سلاطین" کا خون رواں دواں محسوس کر کے نشۂ غرور سے جھومنے لگے گا۔ اُسے "بزدل" کہو تو وہ غصہ سے دیوانہ ہو جائے گا اور اس نیش زن حقیقت کو مٹانے کے لئے موت سے مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ انسان اپنے فعل و عمل کی صرف ایک خاص وجہ کے علاوہ ہر ایک وجہ پیش کر دیتا ہے — اپنے جرائم کے لئے صرف ایک خاص عذر کے علاوہ ہر ایک عذر ظاہر کر دیتا ہے — اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے صرف ایک چیز کے علاوہ ہر چیز کا معترف ہو جاتا ہے — وہ چیز ہے اس کی بزدلی! — بایں ہمہ اس کی تمام تہذیب اس کی اسی بزدلی اور حقیر پست اطاعت پسندی پر قایم ہے۔ وہ اسے اپنی شرافت کہتا ہے۔ گدھا اور بیل بھی ایک خاص حد سے آگے محکومیت گوارا نہیں کر سکتا، لیکن انسان لامتناہی طور پر خود کو ذلیل کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کی بدطینتی خود اس کے ستانے والوں کی نظر میں اس قدر نفرت انگیز ہو جاتی ہے کہ وہ خود ہی اس کی اصلاح پر مجبور ہو جاتے ہیں

ابلیس — بالکل صحیح! — یہ ہے وہ مخلوق جس کے اندر تم وہ شے دیکھتے ہو جسے تمہارے الفاظ میں "قوتِ حیات" کہنا چاہئے!

فرزان بیشک! — کیونکہ ابھی اس مسئلہ کا انتہائی حیرتناک پہلو تو میں نے بیان ہی نہیں کیا۔

ابلیس — وہ کیا ہے؟

فرزان — یہی کہ اس بزدل مخلوق میں سے ہر ایک کو صرف اس کے دماغ میں ایک خیال پیدا کر کے بہادر و شجاع بنایا جا سکتا ہے

مجسمہ — یہ بالکل لغو ہے۔ ایک تجربہ کار سپاہی کی حیثیت سے میں بزدلی کا اعتراف کرتا ہوں — یہ عیب اسی قدر عام ہے جتنی کہ سمندری بیماری اور اسی قدر غیر اہم بھی — لیکن یہ انسان کے دماغ میں خیال پیدا کرنے والی بات بالکل لغو و مہمل ہے۔ میدان جنگ میں نبرد آزمائی کرنے کے لئے تمہیں صرف تھوڑے سے گرم خون اور اس پختہ یقین و علم کی ضرورت ہے کہ شکست فتح سے زیادہ خطرناک ہے

فرزان — یہی وجہ ہے شاید کہ جنگ اکثر بے کار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن انسان اُس وقت تک درحقیقت خوف پر غالب نہیں آتا جب تک وہ یہ تصور نہ کرے کہ وہ ایک عالمگیر مقصد کی کامیابی کے لئے جنگ کر رہا ہے — یعنی ایک خاص ذہنیت و خیال کی خاطر لڑ رہا ہے — صلیبی جنگ کا سپاہی بحری قزاق سے زیادہ بہادر کیوں تھا؟ — صرف اس لئے کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ صلیب کے لئے لڑتا تھا۔ وہ کونسی قوت تھی جس نے صلیبی سپاہی کا مقابلہ اتنی ہی شجاعت کے ساتھ کیا جتنی کہ وہ خود رکھتا تھا؟ — یہ قوت اُن انسانوں کی طاقت تھی جو اپنے واسطے نہیں بلکہ اسلام کی خاطر مصروف پیکار تھے۔ اگرچہ ہم خود اپنے جان و مال کے لئے لڑ رہے تھے لیکن اُنھوں نے ہم سے آئین چھین لیا۔

اس کے بعد جب خود ہم نے بھی اُس عظیم و پُرقوت خیال و اعتقاد کی خاطر نبرد آزمائی کی جسے "کیتھولک کلیسا" یا ایک آزاد مذہبیت سے تعبیر کرنا چاہئے تو ہم نے اُن کو پھر افریقہ کی طرف ڈھکیل دیا

ابلیس — (طنزیہ) کیا فرمایا؟ — آپ اور ایک کیتھولک! — ایک عابد! — مُبارکباد قبول فرمائیے!

مجسمہ — (سنجیدگی سے) دیکھو! — ایک سپاہی کی حیثیت سے میں کلیسا کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔

فرزان — خون نہ کیجئے کپتان صاحب! — یہ آزاد مذہبیت کا خیال و اعتقاد خود اسلام۔ صلیب اور اُن نااہل طفلانہ و غیر مہذب سورماؤں کے بعد بھی زندہ رہے گا جن کی جماعت کو تم فوج کے نام سے یاد کرتے ہو۔

مجسمہ — دیکھو فرزان تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ تمہیں اس دریدہ دہنی کا مزہ چکھاؤں

فرزان — ہاں بشرطیکہ میں اپنی تلوار سے اپنی حفاظت نہ کر سکوں۔ ہر وہ خیال جس کے لئے انسان اپنی زندگی قربان کرے گا صرف ایک آزاد عالمگیر خیال ہی ہوگا۔ جب ایتھن کے باشندے کو آخر کار یہ علم ہوگا کہ اس میں ایک بدوی عرب سے برتر کوئی شے نہیں اور اُس کا پیغمبر بھی محمد سے بلند تر کوئی امتیاز نہیں رکھتا تو وہ بیدار ہوگا — پہلے سے کہیں زیادہ آزاد عالمگیر ذہنیت لئے ہوئے — اور جس غلیظ کوچے میں وہ فاقوں مر رہا ہے اُسی میں ایک عالمگیر آزادی و مساوات کے لئے اپنی زندگی کی قربانی پیش کر دے گا

مجسمہ — بالکل لغو!

فرزان — جس چیز کو تم لغو کہہ رہے ہو صرف یہی ایک وہ شے ہے جس کی خاطر انسان تکمیل انسانیت کے لئے مریں گے اور اس کے لئے اپنی تمام آزادی بخوشی نثار کر دیں گے

ابلیس — بے شک! — یعنی وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہمیشہ تراشتے رہیں گے

فرزان — اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ — درحقیقت اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ موت نہیں بلکہ موت کا خوف ہے۔ ہمیں ذلیل و پست کرنے والی شے دراصل ہلاک کرنا یا ہلاک ہونا نہیں بلکہ ذلیل طور پر زندہ رہنا اور ذلت کی مزدوری و انعام قبول کرنا ہے۔ ایک زندہ غلام یا آقا سے بہتر دس مردہ انسان ہیں۔ ابھی انسان پھر بیدار ہوگا — باپ بیٹے کے خلاف اور بھائی بھائی کے خلاف بغاوت کرے گا — اور یہ سب ایک دوسرے کو انسداد غلامی کی خاطر ہلاک کرنا شروع کریں گے

ابلیس — اور آخر کار یہی آزادی و مساوات جس کے لئے تم قصیدہ خوانی کرتے ہو آزاد سفید فام عیسائیوں کو مزدوری کے بازار میں اُن سیاہ کافر غلاموں سے بھی کہیں ارزاں کر دے گی جو چوراہوں پر نیلام کے ذریعہ فروخت ہوتے ہیں

فرزان — ڈرو نہیں! — سفید فام مزدور کی بھی باری آکر رہے گی۔ لیکن اس وقت میں ان سرابی شکلوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں جو عظیم و بلند خیالات اختیار کر لیتے ہیں۔ میں تمہارے سامنے اس حقیقت کی مثالیں پیش کر رہا ہوں کہ یہ پست جانور جو انسان کہلاتا ہے اور جو اپنے ذاتی خود غرضانہ معاملات میں سراپا ایک بزدل حیوان ہے، ایک بلند و عالمگیر خیال کی خاطر ایک مثالی ہیرو کی طرح جنگ آزما ہو سکتا ہے ایک پُرامن شہری کی حیثیت میں انسان ذلیل و پست ہو سکتا ہے لیکن ایک عقیدے کے پرجوش پرستار کی شکل میں وہ بڑا خطرناک ہے اُسے صرف اس حالت میں غلام بنایا جا سکتا ہے جبکہ وہ روحانی طور پر اس قدر ضعیف ہو کہ عقلی استدلال کو سن سکے۔ میں آپ سب کے سامنے دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر آپ انسان کے سامنے اُس کام کا ایک جزو پیش کر دیں جسے وہ آجکل خدائی کا کام کہتا ہے اور جسے وہ مستقبل میں اور بہت سے جدید ناموں سے منسوب کرے گا تو آپ اُسے اس کام کے اُن تمام نتائج کی طرف سے قطعی بے خوف بنا سکتے ہیں جو اُس کی ذات کے لئے خطرناک ہو سکتے ہیں

سارہ — ہاں ہاں — وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے پہلوتہی کرنے لگے گا اور ان سے جنگ کرنے کے لئے اپنی شریک زندگی کو تنہا چھوڑ دے گا۔

مجسمہ — بہت خوب میری بیٹی! — تم اس کی گفتگو کو اپنی فطری عقل پر حاوی نہ ہونے دینا۔

ابلیس — افسوس کپتان صاحب! — اب جبکہ ہماری گفتگو کا سلسلہ "عورت" کے عنوان تک پہونچ گیا ہے یہ شخص اور بھی زیادہ تقریر و مباحثہ کرے گا۔ بایں ہمہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے لئے ایک یہی عنوان انتہائی دلچسپ چیز ہے

فرزان — معزز خاتون! — ایک عورت کے لئے مرد کی تمام ذمہ داریاں اور فرائض صرف اس ایک کام سے شروع اور اسی پر ختم ہوجاتے ہیں کہ وہ اس عورت کے بچوں کے واسطے روٹی مہیا کردے۔ عورت کے نزدیک مرد کا وجود صرف اس ایک مقصد کا ذریعہ ہے کہ بچے پیدا ہوں اور پرورش پائیں۔

سارہ — کیا ایک عورت کی ذہنیت کی بابت یہی خیال ہے تمہارا؟ — میں اسے انسانیت کی ذلت اور تنفر انگیز حیوانیت کہتی ہوں۔

فرزان — معاف کرنا سارہ! — میں نے عورت کی پوری ذہنیت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ مرد کو ایک جداگانہ جنس کی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میرے ان الفاظ میں انسانیت کی ذلت اس سے زیادہ ہرگز نہیں جتنی کہ خود اپنے متعلق عورت کے اس زاویۂ نظر میں کہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت "ماں" ہونا ہے۔ جنسی لحاظ سے عورت ایک ذریعہ ہے جسے فطرت اپنے بلند ترین کارنامہ کی بقا کے لئے استعمال کرتی ہے۔ جنسی لحاظ سے مرد ایک ذریعہ ہے جسے عورت فطرت کے ارشاد کو انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ بجالانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ وہ جبلّی طور پر یہ جانتی ہے کہ سلسلۂ ارتقاء کی دور دراز گزشتہ منزلوں میں خود اسی نے مرد کو ایجاد کیا — جنسی تنوع عطا کیا — اور تخلیق کیا تاکہ یک "جنسی عمل" کے ذریعہ جو مخلوق پیدا کی جاسکتی ہے اس سے بہتر کوئی شے پیدا کی جاسکے۔ جب تک مرد اس مقصد کی تکمیل کرتا رہتا ہے جس کے لئے عورت نے اسے بنایا ہے اُس وقت تک مرد کو آزادی ہے کہ وہ اپنے خوابوں۔ اپنی حماقتوں اپنے خیالات اور اپنے شجاعانہ مشاغل میں مصروف رہے بشرطیکہ ان سب مشاغل کا مرکز عورت۔ ماں۔ خاندان اور گھر بار کی پرستش ہی رہے — لیکن کس قدر عجلت آمیز اور خطرناک امر تھا ایک ایسے جداگانہ حیوان کو تخلیق کرنا جس کا واحد مقصد آفرینش عورت نے یہ قرار دیا کہ خود اسے بچے عطا کرے! — کیونکہ ذرا دیکھئے اور سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا — سب سے اول تو یہ کہ مرد نے عورت کے ذریعہ اپنی تعداد بڑھالی ہے یہاں تک کہ اب مرد بھی اسی قدر ہیں جتنی کہ عورتیں — اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت اپنے مقصد کے لئے اس زبردست قوت کا صرف ایک حقیر چیز ہی استعمال کرسکتی ہے جو اس نے مرد کے اندر اس کو حمل پروری کی زبردست مشقت سے محفوظ کرکے رکھ چھوڑی تھی۔ یہ زاید از کار قوت مرد کے دماغ اور اعصاب کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ وہ اس قدر قوی ہوگیا ہے کہ عورت جسمانی لحاظ سے اُسی پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ دماغی لحاظ سے وہ اس قدر توانا اور تخیل پسند ہوچکا ہے کہ صرف اپنے ہی جیسے دوسرے انسان پیدا کرنے پر قناعت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اُس نے تہذیب و تمدن کو پیدا کیا — لیکن عورت سے استصواب رائے کے بغیر ہی — اس تہذیب کی بنیاد ہی اس نے اس حقیقت پر رکھدی کہ عورت خانگی خدمت کے لئے ہے۔

سارہ — دیگر امور سے قطع نظر یہ چیز بلاشبہ ایک حقیقت ہے

ابلیس — ہاں! — اور یہ تہذیب! — یہ کیا بلا ہے؟

فرزان — تمہاری پست و فرسودہ زہر افشانیوں کا ایک خوبصورت عنوان! — درحقیقت تہذیب نام ہے مرد کی اس کوشش کا جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ مرد صرف عورت کے مقصد کا ایک ذریعہ نہ رہے بلکہ اس سے بلند تر کوئی مقام حاصل کرسکے۔ زندگی نے صرف اپنی بقا و قیام ہی کے لئے نہیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانی شکل حاصل کرنے اور خود اپنے اسرار کے متعلق مکمل سے مکمل علم پر دسترس پانے کے لئے آج تک جو مسلسل و طویل کوشش جاری کر رکھی ہے اس کا انجام ہنوز مشکوک نظر آتا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ زندگی اور موت و انحطاط کی قوتوں کے درمیان جو معرکہ آرائی قایم ہے وہ کس طرح فتح ہوگی۔ اس جنگ کے تمام محاربات محض اختلاط ہیں اور حقیقی عسکری محاربات کی طرح ان میں سے بیشتر کی فتح و کامیابی کو سپہ سالاروں کی اہلیت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

مجسمہ — یہ مجھ پر ایک طنز ہے — خیر کوئی مضایقہ نہیں — ہاں فرمایئے۔

فرزان — بہ طنز ہے ایک ایسی قوت پر جو تم سے کہیں بلند ہے کپتان صاحب! — بہرحال یہ تو تم نے بھی اپنے پیشے میں تجربہ کیا ہوگا کہ ایک بیوقوف سپہ سالار بھی محاربات میں فتحیاب ہو سکتا ہے بشرطیکہ غنیم کا سپہ سالار اُس سے کسی قدر زیادہ بیوقوف ہو

مجسمہ — (بہت سنجیدگی سے) بالکل صحیح فرزان — بالکل صحیح — بعض گدھے حیرتناک طور پر خوش قسمت ہوتے ہیں

فرزان اچھا تو سنو — "قوت حیات" بیوقوف ہے لیکن اس قدر بیوقوف نہیں جتنی کہ موت و انحطاط کی قوتیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ قوتیں ہمیشہ سے باہمی ملازم بھی ہیں — یہی وجہ ہے کہ "زندگی" جیت جاتی ہے۔ ہم اپنی ملکیت میں وہ سب کچھ رکھتے ہیں جسے قوت تولید کی افراط مہیا کر سکتی ہے اور حرصِ محض قایم و باقی رکھ سکتی ہے۔ تہذیب خواہ کوئی بھی شکل اختیار کیوں نہ کرے یہ یقین ہے کہ دنیا میں بہترین تصنع اور توانا ترین تصنع بروئے کار وجود باقی ہی رہے گا۔

ابلیس — بالکل درست! — یعنی دُنیا میں "زندگی" کا نہیں بلکہ موت کا موثر ترین ذریعہ باقی رہے گا۔ تم اپنی گفتگو میں پیچ در پیچ راستوں پر ہوتے ہوئے اپنی کج بحثی اور پہلو تہی کی ہزار کوششوں کے باوجود آخر کار خود اسی نتیجہ پر پہونچتے ہو جو میں اخذ کرتا ہوں — اور پھر تمہاری تقریروں کا یہ طول!

فرزان — خوب! — طویل تقریریں پہلے کس نے شروع کیں؟ — بہرحال اگر میری گفتگو تمہاری فہم کو ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہوتی ہے تو تمہیں اختیار ہے کہ ہم سے رخصت ہو جاؤ اور حُسن و محبت یا اسی نوعیت کے اپنے دیگر مضمحل کن محبوب مشاغل کی تلاش کرو

ابلیس — (بہت آزردہ ہو کر) یہ الفاظ دیانت و انصاف کے مظہر نہیں فرزان — اور آداب مجلس کے بھی بھی خلاف ہیں۔ فہم و خرد کی دنیا میں مجھے بھی ایک جگہ حاصل ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے اور کون پرکھ سکتا ہے۔ میں بڑی دیانت سے تمہارے ساتھ بحث کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ کامیابی کے ساتھ تمہارے دلایل کو قطع کر رہا ہوں — اگر تم چاہو تو آؤ ایک گھنٹہ اور یہی سلسلہ جاری رہے

فرزان — بہت مناسب! — آؤ۔

مجسمہ — مجھے ذرا بھی امید نہیں کہ تم کسی خاص فیصلہ پر پہونچ سکو گے فرزان — بایں ہمہ چونکہ یہاں اس دنیا میں ہمیں تضیع اوقات کے بجائے "تضیع ابدیت" کرنا ہے اس لئے تم دونوں اپنی بحث کو ضرور جاری رکھو

فرزان — (کسی قدر تنک کر) مرمریں سروائے قدیم شاہکار! — میرا نقطۂ گفتگو تمہاری فہم سے ایک قدم آگے ہے۔ کیا تم سب کو میرے اس نظریہ سے اتفاق ہے کہ "زندگی" ایک ایسی قوت ہے جس نے خود کو منظم کرنے کے لئے بے شمار تجربات کئے ہیں یعنی انسان اور قدیم عفریت نما ہاتھی۔ چوہا اور قدیم دیوہیکل نباتاتی کیڑے — مکھیاں اور پسّو اور پاپایان کلیسا — یہ سب کے سب اسی "قوتِ خام" کو اعلیٰ سے اعلیٰ افراد کی شکل میں ترتیب دینے کی کم و بیش کامیاب کوششیں ہیں — اور ان تمام کوششوں کا آخری مقصد ارفع یہ ہے کہ کسی طرح ایک ایسا وجود ترتیب دیا جائے جو سب کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہو — جسے سب کچھ علم ہو — جس سے کوئی سہو و خطا ممکن نہ ہو اور جسے ان سب خصوصیات کے ساتھ ساتھ خود اپنے وجود کا مکمل و حقیقی علم حاصل ہو — یعنی مختصراً یوں کہو کہ ایک دیوتا! — کیا تمہیں میرے اس نظریہ سے اتفاق ہے؟

ابلیس — میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بحث کی خاطر۔

مجسمہ — میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بحث سے بچنے کے لئے۔

سارہ — جہاں تک رہنمایان کلیسا کا تعلق ہے میں تمہارے ان الفاظ سے شدید مخالفت کرتی ہوں۔ میں تم سے درخواست کروں گی کہ ان بزرگ ہستیوں کو اس موجودہ بحث میں کھینچ کر نہ لائے

فرزان — ان کا نام تو میں نے سارہ محض اس لئے اس ضمن میں لیا ہے کیونکہ مجھے الفاظ میں صوتی یکسانیت کی رعایت مطلوب تھی۔ اور آیندہ میں ان کی طرف کوئی اشارہ نہ کروں گا۔ ہاں تو اب جبکہ سارہ کے اس مختصر اعتراض سے قطع نظر تم سب میری گفتگو سے یہاں تک متفق ہو چکے ہو تو میں ایک قدم اور آگے اُٹھاتا ہوں۔ کیا تمہیں اب اس کے بعد یہ تسلیم نہیں کہ "زندگی" نے دیوتا تخلیق کرنے کی حد و جہد میں جس قدر بھی صورتیں

بنائیں اُن میں اپنی کامیابی کو ناپنے کے لئے حسن ظاہری یا جسمانی تکمیل کو پیمانہ نہیں بنایا کیونکہ جیسا کہ بہت عرصہ ہوا ہمارے دوست ارسطوفانیز نے ظاہر کیا ہے حسن و جسمانی تکمیل کے لحاظ سے پرندے بہت ہی بلند مرتبہ رکھتے ہیں - اُن کی قوتِ پرواز — اُن کے خوبصورت پر و بال — اور پھر ان کی معصومانہ محبت و آشیاں سازی کی وہ شعریت — ان تمام خصوصیات نے اُن کو ظاہری حُسن و جمال اور جسمانی تکمیل دونوں لحاظ سے مخلوق میں اس درجہ غیر معمولی حد تک برتری دیدی ہے کہ اگر "زندگی" کا آخری مطمح نظر واقعی حسن و محبت ہی ہوتا تو یہ ناقابل یقین ہے کہ ان خوبصورت طیور کو تخلیق کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے راستے پر جدوجہد شروع کرتی اور اُس بھدے ہاتھی اور ہیبت ناک بندر کی تخلیق میں عرق ریزی کرتی جس کی اولاد ہم سب ہیں

سارہ — ارسطوفانیز کافر تھا اور مجھے ڈر ہے فرزان کہ تم اس سے کچھ بہتر نہیں ہو

ابلیس — تو ان تمام امور سے تم یہی نتیجہ اخذ کرتے ہو نا کہ "زندگی" بھدی اور بدہیئت مخلوق کی آفرینش چاہتی تھی ؟

فرزان — نہیں ! — کج فہم ابلیس — ہزار بار نہیں — زندگی "دماغ" کی آفرینش چاہتی تھی — دماغ ! — زندگی کی محبوب شے ! — اور ایک ایسا آلہ جس کی مدد سے زندگی صرف شعور ذات ہی نہیں بلکہ تفہیم ذات بھی کر سکے

مجسمہ — یہ تو مابعد الطبیعیات ہے فرزان ! — کس کم بخت شیطان نے کہا ہے کہ تم ..... (ابلیس سے) توبہ معاف کیجئے !

ابلیس — معافی کی ضرورت نہیں - لوگ جب کسی فقرہ پر زور دینے کے لئے میرا نام استعمال کرتے ہیں تو میں ہمیشہ اسے اپنے لئے باعث اعزاز و تحسین تصور کرتا ہوں - میرا نام تمہاری خدمت کے لئے ہمہ وقت حاضر ہے کپتان صاحب -

مجسمہ — شکریہ ! — بڑی عنایت ہے تمہاری — گفتگو کی اپنی قدیم فوجی عادت سے میں جنت میں بھی کبھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا - میں فرزان سے جو سوال کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ زندگی کو ایک "دماغ" کے حصول کے لئے خود کو پریشان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ زندگی خود کو سمجھنا ہی کیوں چاہتی ہے ؟ — صرف خود سے لذت اندوز ہونے پر قناعت کیوں نہیں کرتی ؟

فرزان — اگر "دماغ" نہ ہو تو ہم محض لاعلمی کی کیفیت ہی میں حظ اندوز کر سکتے ہیں — اور یہ لاعلمی سارے کیف و حظ کو تباہ کر دیتی ہے

مجسمہ — صحیح - بالکل صحیح — لیکن میرے خیال میں صرف اس قدر دماغ کافی ہے کہ ہمیں یہ علم ہو سکے کہ ہم مسرور و محظوظ ہو رہے ہیں - میں یہ نہیں سمجھنا چاہتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے - میرا تجربہ ہے کہ ہماری تفریح و مسرت اپنے متعلق فکر و غور کو برداشت نہیں کر سکتی

فرزان — یہی وجہ ہے کہ فہم و خرد اس درجہ نامقبول ہے - لیکن انسان کے پس پردہ زندگی کی جو قوت کارفرما ہے اس کے لئے فہم و خرد ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ گمراہ ہو کر موت کی دُنیا میں پہونچ جاتی ہے - جس طرح زندگی نے قرنوں کی جدوجہد کے بعد آنکھ جیسے حیرتناک جسمانی آلہ کو ارتقاء عطا کیا تاکہ ذی حیات جسم دیکھ سکے کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور اس کی امداد یا ایذا کے لئے کیا چیز اس کی طرف آ رہی ہے اور اس طرح اُن ہزاروں خطرات سے خود کو محفوظ رکھ سکے جو اس سے پیشتر اس کو ہلاک کر ڈالتے تھے بالکل اسی طرح "زندگی" آج ایک ذہنی و دماغی آنکھ کو ارتقاء عطا کر رہی ہے جو کہ مادی دُنیا کو نہیں بلکہ "زندگی" کے مقصد کو دیکھ سکے گی اور اس طرح ہر فرد انسانی کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ اس مقصد کے لئے کارفرما ہو جائے اور اس کی راہ میں ان کوتاہ نظر ذاتی مقاصد کی دیواریں حایل نہ کرے جو کہ آجکل حایل نظر آ رہی ہیں - واقعہ یہ ہے کہ صرف ایک ہی قسم کا انسان ایسا ہے جو ہمیشہ مسرور رہا ہے اور جو مختلف مفادوں اور خود فریبیوں کے تمام اختلافات کے درمیان ایک عالمگیر نگاہِ توقیر و اعزاز سے دیکھا گیا ہے

مجسمہ — تمہارا مطلب فوجی انسان سے ہے -

فرزان — کپتان صاحب ! میرا مطلب فوجی انسان نہیں - فوجی انسان کو قریب آتا دیکھ کر دُنیا اپنی روٹی کو مقفل اور اپنی عورتوں کو غائب و مستور کر دیتی ہے - نہیں ! — میری تحسین کا موضوع "شجاع انسان اور اس کے اسلحہ" نہیں بلکہ میرا مرکز نظر وہ شخص ہے فلسفی انسان — وہ انسان جس کا غور و فکر دنیا کے باطنی ارادہ و مقصد کو بے نقاب کرتا ہے — جس کی قوت اختراع و ایجاد اس مقصد کی تکمیل کے ذرایع

تلاش دھیا کرتی ہے — اور جس کا فصل و عمل ان دریافت شدہ ذرایع سے اس اہم مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اس انسان کے علاوہ اور باقی تمام اقسام کے انسانوں سے میں قطعی اُکتا چکا ہوں — : تی سب کے سب ناکام ہیں۔ مایوس کن اور مضمحل حد تک ناکام — جب میں کرۂ ارض پر موجود تھا تو تمام قسم کے ماہرین علوم وفنون میری تاک میں لگے رہتے تھے تاکہ میرے وجود میں کوئی ایسا نقص یا بیمار جز دریافت کر سکیں جس کو وہ اپنا تختۂ مشق بنائیں۔ علم الادویہ کے ماہرین مجھے اس فکر وغور پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنے جسم کی حفاظت کے لئے کیا کرنا ضروری ہے اور محض قیاسی امراض کے لئے نیم حکیمانہ قسم کی دوائیں پیش کرتے تھے۔ میں اُن کو جواب دیتا تھا کہ میں خلل دماغ میں مبتلا نہیں ہوں۔ وہ مجھے جاہل و احمق قرار دیتے اور چلے جاتے تھے۔ مذہبیات کے علماء مجھے اس غور و فکر پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنی روح کی حفاظت کے لئے کیا کرنا ضروری ہے — لیکن میں ذہنی اختلال سے روحانی طور پر بھی اسی قدر دور تھا جتنا کہ جسمانی اعتبار سے اور اس لئے اس مشورہ پر بھی کوئی کوئی توجہ نہیں دیتا تھا — اس لئے یہ لوگ مجھے کافر و بیدین قرار دیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد سیاست داں آتے تھے اور کہتے تھے کہ فطرت کے تمام کارخانے میں صرف ایک ہی مقصد کارفرما ہے اور وہ یہ کہ سیاست کا ماہر کسی طرح پارلیمنٹ میں پہونچ جائے۔ میں اپنے سیاسی دوست کو جواب دیتا تھا کہ مجھے اس کے پارلیمنٹ میں پہونچنے یا نہ پہونچنے کی کوئی پروا نہیں۔ یہ سُن کر وہ مجھے مردود سیاست قرار دیتا اور چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد رومانوی انسان آیا — فنون لطیفہ کا ماہر — اپنے محبت انگیز نغمات و تصاویر اور نظمیں لئے ہوئے — یہ وہ شخص تھا جس کی معیت میں مجھے کئی سال تک بڑی مسرت اور بڑا فایدہ حاصل ہوا کیونکہ اُس کی خاطر میں نے اپنے حواس کو ارتقاء و تربیت دی۔ اُس کے نغمات نے میرے کانوں کو سننے کا ایک بہتر طریقہ، اس کی تصاویر نے میری آنکھوں کو دیکھنے کا ایک بہتر سلیقہ اور اُس کی نظموں نے میرے دل کو محسوس کرنے کا ایک گہرا انداز عطا کیا — لیکن اس شخص نے مجھے انجام کار عورت کی پرستش میں مبتلا کر دیا

سارہ — فرزان!

فرزان — ہاں — مجھے یقین ہو گیا کہ عورت کی آواز ہی میں نغمہ کی تمام موسیقیت پنہاں ہے — اس کے حسن صورت ہی میں بہار کی تمام رعنائیاں اور اس کی روح میں نظم و شعریت کے تمام جذبات مخفی ہیں۔

سارہ — اور غالباً یہ چیز تمہارے لئے بڑی مایوس کن ثابت ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر تم نے ان تمام خوبیوں کو عورت کی طرف منسوب کیا تو کیا اس میں کوئی عورت کا قصور تھا؟

فرزان — ہاں ایک حد تک! — کیونکہ ایک حیرتناک جبلّی چالاکی کے ساتھ وہ خود خاموش رہی اور مجھے اس امر کی اجازت دیدی کہ میں اُسے اسی طرح محاسن سے متصف کرتا رہوں اور اُس کی بابت خود اپنی قیاس آرائیوں اور خیالات و احساسات کو غلطی سے اُس کی فطرت کے حقایق سمجھتا رہوں میرا دوست یعنی "رومانوی انسان" خود اس قدر مفلس اور ڈرپوک شخص تھا کہ جو عورتیں حسن و جمال اور تہذیب و اخلاق میں اس کے بلند ترین معیار کے لحاظ سے مکمل ثابت ہوئی تھیں وہ ان کے نزدیک پہونچنے سے محروم تھا اور اس لئے وہ صرف اپنے خوابوں کا یقین اپنے ساتھ لئے ہوئے اپنی قبر میں جا کر سو گیا۔ لیکن فطرت اور حالات مجھ پر زیادہ مہربان تھے۔ میں اعلیٰ خاندان سے متعلق ایک اور دولت مند انسان تھا اور اگر کبھی میری شخصیت عورتوں کو مسرور کرنے میں ناکام ثابت ہوتی تھی تو میری زبان اُن کی قصیدہ خوانی کر کے اس کمی کو پورا کر دیتی تھی حالانکہ عام طور پر میں نے ان دونوں امور میں خود کو خوش قسمت پایا ہے۔

مجسمہ — بڑے خود نما ہو تم!

فرزان — بالکل صحیح — لیکن میری خود نمائی بھی مسرور کن تھی — مجھے تجربہ ہوا کہ جب کوئی عورت میری ذات میں ایک جاذبیت و دلکشی محسوس کرنے لگتی تھی تو وہ مجھے اس خیال پر یقین کرنے کے لئے پوری آزادی دیتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جب میرا اقدام محبت منظور کر لیا جاتا تو وہ کبھی بھی یہ نہیں کہتی تھی کہ — "میں مسرور ہوں — میری محبت مطمئن ہے" — وہ ہمیشہ سب سے پہلے تو یہ کہتی کہ "آخر کار تمام بندشیں اور رکاوٹیں دور ہو ہی گئیں" — اور اس کے بعد وہ دریافت کرتی کہ — "اب پھر کب آؤ گے؟"

سارہ — بالکل یہی بات مرد کہتے ہیں۔

فرزان — میرا دعویٰ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ لیکن عورتیں سب کی سب یہی کہتی ہیں۔ ان کے دو جملوں سے میں ہمیشہ خائف و سراسیمہ ہو کر رہ گیا ہوں کیونکہ ان دونوں میں سے پہلے جملہ کا مفہوم تو یہ ہے کہ اس تمام معاشقہ سے عورت کا حقیقی مقصد اور اصلی جذبہ صرف یہ تھا کہ میری شخصیت کی چہار دیواریوں کو منہدم کر کے میرے وجود پر قابض ہو جائے ——— اور دوسرے جملہ کا مطلب اعلانیہ طور پر یہ ہے کہ اب آئندہ وہ مجھے اپنی ایک مقبوضہ و مملوکہ شے تصور کرتی ہے اور میرے تمام اوقات کو اپنے لئے وقف سمجھتی ہے

ابلیس — یہی وہ مقام ہے جہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تمہارے پہلو میں دل نہیں ہے۔

مجسمہ — (اپنا سر ہلاتے ہوئے) عورتوں کے ادا کردہ الفاظ تم کو دہرانے نہیں چاہئے۔

سارہ — (سختی سے) وہ الفاظ تمہارے لئے مقدس امانت ہیں۔

مجسمہ — بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ عورتیں ایسا کہتی ضرور ہیں۔ بندشوں اور قیود کی تو مجھے کبھی زیادہ پروا نہیں رہی لیکن ہاں یہ دوسری بات کسی حد تک حیرت و صدمہ کی چیز ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فرزان — اور اس کے بعد یہ عورت جو قبل ازیں کافی مسرور اور کاہل رہ چکی ہے یکایک فکرمند اور مجھ پر حد سے زیادہ متوجہ ہو جاتی تھی۔ اب اس کا ایک مستقل شغل یہ ہو جاتا تھا کہ میرے خلاف سازشیں اور چال بازیاں کرتی رہے ——— میرا تعاقب کرے ——— مجھے سخت نگرانی میں رکھے ——— میری خاطر اپنی کمین گاہ میں بیٹھی رہے اور اس طرح اپنے شکار کو بالکل "یقینی و محفوظ" بنانے کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کر دے ——— اور یہ شکار کون تھا؟ — میں! ——— لیکن یقیناً یہ چیز ہرگز وہ نہ تھی جس کی خاطر میں نے یہ جھگڑا مول لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بالکل مناسب اور بالکل فطری قرار دیا جائے، لیکن مجھے جس موسیقی۔ مصوری اور شعریت کی تلاش تھی اور ایک حسین عورت کی شکل میں جس مجسمۂ مسرت کی جستجو تھی اس محبت میں اس کا کوئی وجود نہ تھا ——— اسی لئے میں اس سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگ گیا ——— مجھے اکثر اس سے فرار ہونا پڑا ——— واقعہ تو یہ ہے کہ میں اس طرح فرار ہونے میں کافی مشہور ہو گیا۔

سارہ — تمہارا مفہوم بدنام ہونے سے ہے۔

فرزان — میں تمہارے پاس سے نہیں بھاگا۔ کیا تم دوسری عورتوں سے فرار ہونے پر مجھے ملزم تصور کرتی ہو؟

سارہ — کس قدر لغو باتیں کرتے ہو! — تم اسوقت ایک ۷۰ سال کی معمر عورت سے گفتگو کر رہے ہو۔ اگر تمہیں موقع مل جاتا — یا یوں کہو کہ اگر میں تمہیں ایسا موقع دیدیتی تو تم یقیناً مجھے بھی چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مجھ سے گریز اختیار کرنا تمہارے لئے اس قدر سہل ثابت نہ ہوتا جتنا کہ شاید چند دوسری ہستیوں کے سلسلہ میں ہوا ہوگا۔ اگر مرد اپنے گھر اور اپنے فرائض کے ساتھ وفادار نہیں رہتے تو ضروری ہے کہ ان کو بہ جبر اس پر آمادہ کیا جائے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم سب مرد یہی چاہتے ہو کہ موسیقی و مصوری و شعریت کے خوبصورت مجسموں سے شادی کرو ——— لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم یہ حسین مجسمے نہیں پا سکتے کیونکہ دنیا میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر محض گوشت و پوست سے بنی ہوئی عورتیں تمہارے نزدیک قابل پسندیدگی نہیں تو پھر تمہیں ان کے بغیر ہی زندگی گزارنا ہوگی۔ عورتوں کو محض گوشت و پوست سے بنے ہوئے شوہروں پر قناعت کرنا ہوتی ہے اور تمہیں گوشت و پوست سے بنی ہوئی عورتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔ (ابلیس کچھ مذبذب نظر آتا ہے اور مجسمہ ناگوار انداز میں منہ بناتا ہے) میں دیکھتی ہوں کہ تم میں سے کسی کو بھی یہ چیز پسند نہیں ——— لیکن بایں ہمہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس لئے اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو بجبر و اکراہ اسے قبول کرنا ہی ہوگا۔

فرزان — عزیز خاتون! تم نے رومان کے خلاف میرے تمام دلایل و خیالات کو چند جملوں میں ادا کر دیا ہے۔ بالکل یہی وجوہ ہیں جن کے تحت میں نے اس رومانوی انسان سے بھی آخر کار کنارہ کشی اختیار کی جو اپنے مسحور و حماقت زدہ اور فریب خوردہ حواس کو اپنی فنی و جمالیت پسند فطرت سے تعبیر کرتا تھا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی بدولت میں اپنی آنکھوں اور کانوں کا استعمال سیکھ گیا لیکن میں نے اس سے کہدیا کہ ایک فلسفۂ حیات کے اعتبار سے اس کی یہ تمام پرستش حسن و نسائیت اور تلاش مسرت ایک پرکاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ سن کر اس نے مجھے ایک کندۂ ناتراش مادیت پرست

قرار دیا اور چلا گیا -

سارہ — اس سے معلوم ہوا کہ عورت نے اپنے تمام نقایص و معائب کے باوجود تمھیں کچھ سکھلایا بھی ضرور -

فرزان — عورت نے میرے لئے اس سے کہیں زیادہ کام کیا۔ اس نے دیگر تمام تعلیمات کا مفہوم بھی مجھے سمجھایا — آہ! میرے دوستو — نہ پوچھو کہ جب پہلے پہل حجابات و قیود اُٹھے تو کس قدر حیرتناک روشنی میری عقل و فہم پر طلوع ہوئی! — میں تو طیار کیا گیا تھا مسحور ہونے کے لئے — مست و مخمور ہو جانے کے لئے اور محبت کے نوجوان خواب کے تمام طلسمات میں جذب ہو جانے کے لئے — لیکن اُف! جب درمیانی بندشیں اور رکاوٹیں ہٹ گئیں تو میں نے دیکھا کہ میری قوت ادراک و فہم اس قدر واضح و تیز اور میرا شعور تنقید اس درجہ اور بے لاگ حساس ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے کبھی بھی نہ ہو سکا تھا۔ میری محبوبہ کی ذات کا ہر ایک عیب اُس کے انتہائی حاسد رقیب کو بھی اس درجہ وضاحت کے ساتھ نظر نہ آ سکتا تھا جتنا کہ مجھے — وہ مجھے بیوقوف نہیں بنا سکی — میں نے اس کو قبول کیا پورے ہوش و حواس کے ساتھ — اس آپریشن کے وقت میں کلورافارم کے زیر اثر نہ تھا!

سارہ — لیکن تم نے اسے قبول تو کیا!

فرزان — یہ ایک الہام تھا — اس ساعت سے پیشتر میں نے کبھی اپنے اس شعور و احساس کو ضایع نہ ہونے دیا تھا کہ اپنا مالک میں خود ہوں — اور کبھی کوئی قدم ایسا نہ اُٹھایا تھا جس کا میری عقل و خرد نے جایزہ لیکر مناسب قرار نہ دیدیا ہو۔ میرا یہ عقیدہ ہو چکا تھا کہ میں ایک خالص استدلالی مخلوق ہوں — ایک مفکر! — احمق فلسفی کا ہمنوا ہو کر میں بھی کہتا تھا کہ "میں زندہ ہوں اور اس لئے سوچتا ہوں" — نیز یہ کہ "میں اور زیادہ سوچوں گا اور اس لئے اور زیادہ زندہ بن سکوں گا"

مجسمہ — یہ الفاظ تو انتہائی غیر مادی اور مابعد الطبیعیات کی دنیا سے متعلق معلوم ہوتے ہیں فرزان — اگر تم ٹھوس اور مادی حدود میں رہو اور اپنے دریافت کردہ حقایق کو عورتوں کی بابت دلچسپ و رنگین حکایات کی صورت میں بیان کرو تو تمھاری گفتگو کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔

فرزان — لیکن اب مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ جب میں "عورت" کے بے پناہ قرب میں اس کے بالکل بالمقابل استادہ تھا تو میرے صاف و روشن اور تنقیدی دماغ کا ہر ایک ریشہ مجھے متنبہ کرتا تھا کہ میں اُسے نظر انداز کر دوں اور خود کو بچا لوں۔ میں "عورت" کی طرف آگے بڑھنا چاہتا تھا تو میرے اخلاق چلا اُٹھتے کہ — "ہرگز نہیں" — میرا ضمیر پکارتا تھا "ہرگز نہیں" — میرا جذبۂ شجاعت اور خود عورت کے لئے میرا احساس ترحم مجھے روکتا تھا کہ "ہرگز نہیں"۔ میری سلامتی کے لئے میری مصلحت اندیشی کہتی تھی کہ "ہرگز نہیں" — میری سماعت کو ہزاروں نغموں کی مشق حاصل تھی اور میری بصارت کو ہزاروں تصویروں کی — ان دونوں نے عورت کی آواز — عورت کی شکل و صورت اور عورت کے رنگ و رعنائی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے سامنے ڈال دئے اور ان منتشر اجزا میں مجھے صاف نظر آ گیا کہ اب سے تیس سال کے بعد اس عورت کی شکل و صورت کیسی ہو جائے گی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہنستے ہوئے بوڑھے منہ کے اندر ایک مردہ دانت پر سونے کی جھلک نمایاں ہے — میں نے محسوس کیا کہ اس کے بوڑھے رگ و ریشہ کے کیمیاوی اجزاء سے عجیب قسم کی بو آ رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اپنے حسین رومانوی خوابوں میں فردوس کے دلفریب میدانوں کے درمیان ایک ایسی مخلوق کے پہلو بہ پہلو محو خرام تھا جو موت اور بوڑھاپا دونوں سے آزاد نظر آتی تھی اور جس کی تخلیق خود حسن سے ہوئی تھی — لیکن اب زندگی کے اس اہم موقع پر وہ تمام خواب مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ مجھے وہ سارے خواب اب تک یاد ضرور تھے اور میں اُنھیں دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جد و جہد بھی کرتا تھا، لیکن اب وہ سب کے سب انتہائی بے بنیاد و مہمل اختراعات نظر آتے تھے۔ میری قوت تمیز و فیصلہ کسی طرح اپنی صحت کو قربان کرنا نہیں چاہتی تھی اور میرا دماغ اب بھی ہر معاملہ میں "ہرگز نہیں" کی صدا بلند کرتا تھا — اور پھر ٹھیک اس وقت جبکہ میں اس عورت سے معذرت کے ساتھ گریز اختیار کرنا چاہتا تھا "زندگی" نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور اس عورت کی آغوش میں مجھے اس طرح پھینک دیا جیسے کوئی ملاح مچھلی کے ایک ناکارہ ٹکڑے کو ایک بحری طائر کے منہ میں پھینک دے -

(باقی)

مسعود جاوید (بی-اے)

ہماری ادبی تاریخیں

ادھر کچھ دنوں سے اُردو کے سمجھدار پڑھے لکھے طبقے میں بڑے شد و مد کے ساتھ یہ بات زیر بحث ہے کہ ابھی تک اُردو ادب کی کوئی صحیح اور مکمل تاریخ لکھی گئی ہے یا نہیں۔ اور اگر کسی ادبی تاریخ کو تاریخ مانا جائے تو وہ کونسی تاریخ ہو سکتی ہے۔ اور اگر جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ صحیح تاریخیں نہیں ہیں تو اُردو ادب کی تاریخ کس طریقہ پر لکھی جائے۔ یہاں نہ ہمیں اُردو کی ادبی تاریخوں کی تاریخ بیان کرنا ہے نہ اس کے ارتقاء سے بحث کرنا ہمارا مقصد ہے نہ ہم کسی خاص تاریخ پر اپنا خیال ظاہر کریں گے بلکہ چند باتیں ذہن میں ہیں جو ہمارے نزدیک تاریخ کے لئے ضروری ہیں اور جس سے اُردو کی ادبی تاریخیں بالکل عاری ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی غیر ضروری باتیں ہیں جو غلطی سے ہمیشہ تاریخ سمجھ کر ادبی تاریخوں میں ٹھونس دی گئی ہیں اور جو اس بات کا بالکل صاف ثبوت ہیں کہ ہمارے مورخین کے ذہن میں تاریخ اور ادبی تاریخ کا مفہوم صاف اور واضح نہیں ہے اس کی متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ مگر سب سے بڑی وجہ ہماری سمجھ میں، ہماری تحقیق و تنقیح کی کمی اور نامکمل تذکروں کی مثالیں ہیں جن پر ہماری تاریخی اساس قایم ہے۔

تاریخ انسان کے مادی عمل و حرکت کا مرقع ہے۔ تاریخ ادب، ادبی افکار، عمل و حرکت کا مجموعہ ہے جو مادی ہوگا اور جسے قید زمان و مکان سے آزاد ہونا چاہیئے۔ تاریخ صرف ماضی ہی کی نہیں ہو سکتی۔ تاریخ ادب میں ادبی افکار کی شرط اس لئے ہے کہ افکار فلسفیانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ سیاسی بھی اور تجرباتی بھی ..... اور ظاہر ہے کہ اگر ان خیالات میں ادبی جھلک نہ پیدا ہوئی تو وہ ادبی تاریخ کے ٹکڑے نہیں بن سکتے۔ ادبی تاریخ فلسفیانہ، سیاسی، عمرانی روحانی ہو سکتی ہے مگر فلسفہ۔ سیاست۔ عمرانیات ادبی تاریخ ہرگز نہیں بن سکتیں۔ تاریخ کے ساتھ مادہ کی قید اس لئے ہے کہ بغیر مادہ کے کوئی حرکی عمل ظہور میں نہیں آسکتا اور تاریخ صرف خیالی کبھی نہیں ہو سکتی

اُردو ادب کی تاریخ زیادہ تر خیالی اور بیشتر روایتی ہے۔ اُردو کی تاریخ نے تذکروں کی فضا میں آنکھ کھولی جہاں زیادہ تر سنے سنائے واقعات اور قیاس سے کام لیا جاتا تھا۔ تحقیق و تدقیق کا شعور نہ تو پیدا ہوا تھا اور نہ لوگ اتنی زحمت گوارا کرنا پسند کرتے تھے۔ ہم صحیح طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُردو میں تذکرہ نویسی کا خیال کیونکر پیدا ہوا مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ فارسی تاریخیں اور کچھ تذکرے پیش نظر رہے ہوں گے۔ مگر کہیں کہیں اس قیاس سے انحراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ فارسی تذکرے زیادہ تر شہنشاہ وقت کے اوصاف کے حامل ہوا کرتے تھے اور شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ محض اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس سے بادشاہ کی علم دوستی اور ذوق پر روشنی پڑتی تھی[1]۔ صرف شعراء اور ادیبوں کے ماحول، ان کے ذہن و شعور کا اظہار ہرگز مدنظر نہ ہوتا۔ اس لئے ہم اُردو کے تذکروں کو ایک درمیانی چیز تصور کرتے ہیں۔

کچھ مکمل اور مربوط تذکرہ جو اُردو کے شعراء کا ملتا ہے وہ میر کا نکات الشعراء ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا ہے[2]۔ نکات الشعراء سے لیکر شمیم سخن، تذکرہ صفا بدایونی تک ۹ یا ۱۰ تذکروں کو الٹ جایئے مگر کہیں بھی سرسری سوانح حیات، کلام کی معمولی خصوصیات یا پھر زندگی کے کچھ با اخلاق چٹکلوں کے علاوہ آپ کو کچھ نظر نہ آئے گا اور ان واقعات و خصوصیات میں ذاتی بغض و عناد یا پسند کا بیشتر حصہ شامل ہوگا۔ نکات کا ایک اقتباس مظہر جانجاناں کے متعلق ہم پیش کرتے ہیں:۔

---

[1] صرف تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور لباب الالباب کو اس صف سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ سنجری دربار کے نقشے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ قابوس نامہ نوشیرواں کے فرامین اور ادھر اُدھر کے واقعات سے متعلق ہے۔ اس میں شاعروں کا کوئی تذکرہ نہیں۔ رشید الدین وطواط کی حدائق السحر میں مثالیں دیتے وقت اور بعض وقت عروضی بحثوں میں کہیں کہیں شاعر کے کلام پر کچھ روشنی پڑ جاتی ہے۔ [2] خان آرزو کو سب سے پہلا تذکرہ نگار کہا جاتا ہے۔ مگر چونکہ تذکرہ نایاب ہے اس لئے ہم ان کو پہلا تذکرہ نگار ماننے سے قاصر ہیں۔

"مظہر تخلص۔ مردیست مقدس و مطہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال۔ شہرۂ عالم۔ بے نظیر۔ معزز۔ کرم اصلش از اکبر آباد است۔ پدر او مرزا جان۔ نام داشت و از فرط شفقت مرزا جان جاناں می گفت۔ بندہ بہ خدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ۔ اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند۔۔۔۔ مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر مولف آمدہ است۔ از کلیم و سلیم پائے کمی نہ دارد۔ اگرچہ شعر گفتن دوں مرتبہ اوست لیکن گاہے متوجہ ایں فن حاصل می شود"

یہ اقتباس اُردو کی تاریخی طرز فکر پر کافی روشنی ڈالتا ہے اور یہ بات بھی واضح کرتا ہے کہ ہمارے موجودہ مورخین آج تک فن تاریخ نگاری میں کہاں تک ترقی کر سکے ہیں۔ آج بھی جب ہم اُردو ادب کی تاریخوں کے اوراق اُلٹتے ہیں تو کم و بیش یہی ترتیب اور ایسے ہی واقعات ملتے ہیں جس میں کسی قسم کی کمی زیادتی کرنا گویا گناہ خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑا اضافہ جو اُردو ادب کے مورخین نے تذکروں کے بعد کیا، وہ اُردو کی پیدائش کی تفتیش اور اس کی تفصیلی بحث ہے۔ تاریخ کا بیشتر حصہ اس قضیہ کے فیصل کرنے پر صرف کیا جاتا ہے کہ آیا اُردو دکن سے نکلی یا پنجاب سے اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ بایں ردوقدح آج تک یہ معاملہ طے نہ ہو سکا۔ باوجود متعدد دلایل کے لوگ قطعی رائے دینے سے آج تک گھبراتے ہیں۔ اور کیوں نہ گھبرائیں اس لئے کہ تحقیق خام ہے۔ نتیجہ کے طور پر ہر مورخ جب تاریخ لکھنا شروع کرتا ہے تو اسکا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس اکھاڑے میں کودے اور کافی وقت اور کتاب کا کافی حصہ اس پر برباد کرے۔

ہم نے یہ بات متعدد بار کہی ہے کہ اُردو میں تاریخ لکھنے کا رواج بالکل روایتی ہے۔ عموماً ہمارے مورخ ادیب کے متعلق ذاتی تحقیقات و تجربات کو کم کام میں لاتے ہیں۔ چند افسانے، واقعات اور تفریحی جملے جو ان سے پہلے کے تذکروں یا تاریخ نما کتابوں میں لکھ دئے گئے ہیں، ان کا دہرایا جانا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ غالب اس لئے بڑا شاعر ہے کہ لوگ کہتے ہیں یا فلاں تاریخ یا تذکرہ کا بیان ہے۔ غالب اس لئے مشکل پسند ہے کہ آغا جان عیش نے کہدیا:۔

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے — مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب اس لئے فلسفی ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف یا عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھدیا۔ ہمارے مورخین خود کوئی رائے دینے سے گھبراتے ہیں اور یہ کوشش نہیں کرتے کہ شاعر یا ادیب کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس کے تخیل کی گہرائیوں میں اُتریں۔ اس کی آواز کے وزن کو خود سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی نہ ہو سکا۔ اُردو ادب کے مورخین اور نقادوں کو ایک لفظ "بقول" ایسا بھایا ہے کہ وہ اس سے الگ ہونا کسی حالت میں بھی پسند نہیں کرتے جہاں کسی کے متعلق کوئی رائے دینی ہوئی لکھ دیا: بقول فلاں آپ کا کلام ایسا ہے۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ ایک بیسویں صدی کے مشہور ادبی مورخ اپنی "تاریخ ادب اُردو" میں سودا کے متعلق کہتے ہیں:۔

"میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں خود سودا کے زمانہ میں یہی خیال ارباب فن کا تھا، چنانچہ حکیم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوئے (میر تقی) نہ رسیدہ۔ الحق آنست کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا در یابست بے کراں و میر نہر بیت عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میر را بر مرزا برتری است و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری"۔

گویا سکسینہ صاحب، سودا اور میر کے حالات زندگی و کلام سے خود کوئی رائے قایم نہیں کر سکتے۔ اور جو رائے قایم کرتے ہیں وہ یہ ہے "میر صاحب کی شہرت ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں[1]"۔ اور ظاہر ہے کہ یہ رائے اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ کہا جائے "میر میر ہیں اور سودا سودا"۔[2] پھر سکسینہ صاحب قاسم کے بیان کے بعد ایک دوسری روایت شروع کر دیتے ہیں:۔

"اسی طرح ایک مشہور صاحب دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کا نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا کہ "دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام 'آہ' ہے اور مرزا کا کلام 'واہ' ہے"۔

---

[1] اور لطف یہ ہے کہ یہ رائے بھی ان کی رائے نہیں ملاحظہ ہو آب حیات ص۱۲۳ "کہتے ہیں کہ مرزا قصیدہ گوئی کے بادشاہ ہیں، مگر غزل میں میر تقی کے برابر سوز و گداز نہیں"۔ حکیم قدرت قاسم کا اقتباس بھی آب حیات ہی سے لیا گیا ہے۔ [2] خیالات تو سکسینہ صاحب نے ملائے ہی تھے۔ الفاظ عسکری صاحب کے ترجمے نے بہت کچھ ملا دئے۔

اور پھر اپنی رائے دیتے ہیں

"حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے اُستاد تھے"

اب ذرا آبِ حیات ملاحظہ ہو:

"ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے انھیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا دونوں صاحبِ کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے اور مرزا صاحب کا "واہ" ہے" (آبِ حیات ص۱۶۳)

اُردو ادب کی ایک تاریخ کا تضحیکی نمونہ آپ کے سامنے پیش ہوا۔ مگر اس کا الزام صرف سکسینہ صاحب ہی پر نہیں ہے، سبھی تاریخیں اس کا شکار ہیں۔[1] طوالت کے ڈر سے ہم اور اقتباسات نہیں پیش کر رہے ہیں ورنہ گلِ رعنا۔ سیر المصنفین وغیرہ میں بھی یہی چیزیں بعینہٖ اسی طریقے سے ملتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ صرف میر و سودا ہی کے ساتھ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر شاعر کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ چند رٹے ہوئے جملے ہوتے ہیں جو اُردو ادب کا مورخ اور طالب علم ہر شاعر کی تعریف میں صرف کر دیا کرتا ہے۔ آپ کسی بھی شاعر کے کلام پر رائیں اور تنقیدیں ملاحظہ فرمائیے آپ کو یہ جملے ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ملیں گے۔ آپ کسی بھی تاریخ کو اُٹھالیں اور میر و سودا کا بیان پڑھنا شروع کر دیں، آپ کو یہ جملہ ضرور ملے گا "میر کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ" ظاہر ہے کہ ایک بالغ ذہن اس جملے کو پڑھ کر اور چیزیں بھی جاننا چاہے گا مگر کہیں اس کا جواب مشکل ہی سے ملے گا کہ آخر میر کے کلام میں 'آہ' کیوں ہے اور مرزا کے کلام میں 'واہ' کس لئے وہ کون سی شعوری یا غیر شعوری تحریک تھی جس نے میر کو رونا سکھا دیا اور وہ کون سا اثر تھا جس نے سودا کے قلم سے "لکھتا ہوں میں اک شیخ بریلی کی حکایت" جیسے مضحک قصے پیدا کئے۔ اس کا جواب آپ کو تاریخ کے اوراق مشکل ہی سے دے پائیں گے۔

آبِ حیات اور آزاد کا دور وہ دور تھا جس میں بہت سی باتیں پردۂ خفا میں تھیں۔ بہت سے خیالات و واقعات تجربہ گاہوں میں پڑے تھے۔ نہ علم نفسیات نے اتنی ترقی کی تھی اور نہ تنقید کا کوئی سائنٹفک طریقہ معلوم تھا۔ تحقیقی ذرائع اور شعور دونوں کی کمی تھی انحطاطی عناصر پورے طور پر اپنا کام کر رہے تھے۔ ذہنی اُلجھنیں اور قرایت زلف پیچاں ہی کو جائے امن بنائے ہوئے تھیں ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ان روکھے پھیکے اور خشک موضوعات کی سمت کون متوجہ ہوتا۔ کسے اتنا دماغ تھا کہ وہ تذکروں پر جراحی عمل کام میں لاتا اور روایات و قصص کو تحقیق کی کسوٹی پر کستا۔ اگر آزاد نے لطیفے، چٹکلے اور بعض بے بنیاد نقلوں کا سہارا لیا تو ان کی غلطی قابلِ عفو ہو سکتی ہے جبکہ آج اتنی آسانیوں اور اتنے ذرائع کے باوجود مورخین یہی لکیریں پیٹتے چلے آتے ہیں۔ تاہم آبِ حیات نے ایسی ایسی باتیں بتائیں جن سے اس زمانہ کا ماحول، وقت کی رفتار، طرزِ تحریر، سوسائٹی وغیرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے اور جسے آج بھی ہماری موجودہ تاریخیں پیش کرنے سے قاصر ہیں ہم کچھ اقتباسات، آبِ حیات اور موجودہ تاریخوں سے پیش کرتے ہیں۔ آبِ حیات کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ اُردو شاعری کے چوتھے دور کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:-

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہلِ مشاعرہ آن پہونچے۔ یہ کچھ لوگ ہیں ع ان کا آنا غضب کا آنا ہے"۔ ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہونگے جن کی شوخی اور طراری طبع بارمتانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں گے اور ہنسائیں گے کہ منھ تھک جائیں گے مگر ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے نہ لگی عمارتوں کو بلند اُٹھائیں گے۔ انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان سے دوسرے مکان کو سجائیں گے ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرّے سجائیں گے۔ کبھی انھیں کو پھولوں کی گیندیں بنالائیں گے اور وہ گل بازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملے گا۔ ایسے ایسے قدرداں ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول لے گا"

اب اسی دور پر ایک جدید اُردو تاریخ کی تمہید ملاحظہ ہو:

انشاؔ اور مصحفی کا زمانہ

اس دور کی ترقیاں — شعراء کے طبقات کی ترتیب کوئی چیز فرضی نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعراء ایک دور

---

[1] گلِ رعنا مصنفہ عبدالحی میں ہر صفحہ پر پانچ چھ مرتبہ "بقول آزاد بقول آزاد" ملے گا۔

کے ماقبل کے دور کے بعض شعراء کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے شاعر دور ماقبل میں نوجوان اور نو آموز تھے اور اسوقت انھوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دور ماقبل کے شاعر کہن سال اور مشاق مشہور ہو چکے تھے اس کے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اس دور میں بہ مقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لے لی۔ اس معاملہ میں زبان اردو انشاء کی بہت احسان مند ہے جنھوں نے اس کی توسیع اور ترقی کے لئے بہت سے نئے تجارب اختیار کئے۔ مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے"۔

(تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ)

یہ دونوں اقتباسات ملاحظہ کیجئے اور اس دور کی خصوصیات پر کس کے یہاں زیادہ روشنی پڑتی ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ مواد اور اختصار خاص طور سے قابل توجہ ہے۔

عموماً ہمارے مورخین نے تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جو بہت کچھ سوانح حیات سے متعلق ہوا کرتا ہے جس میں کہیں کہیں سیرت نگاری کی بہت دھندلی جھلک نظر آتی ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں شاعر کے کلام پر رائیں ہوا کرتی ہیں جن کا بیشتر حصہ تصیدہ ہوتا ہے۔ سوانح حیات کا ایک بڑا حصہ جیسا کہ ابھی اوپر کہا جا چکا ہے روایتی ہوا کرتا ہے جو دوسروں سے مستعار ہوتا ہے ——— اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے ہم مورخین کو تھوڑی رعایت دے سکتے ہیں اس لئے کہ مواد کی فراہمی میں بعض اوقات ایسی دقتیں ضرور پیش آتی ہیں مگر جہاں سے سیرت نگاری کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں ہم مورخ کو قطعی معاف نہیں کر سکتے۔ شخصیت کی پرکھ میں یکسانیت کا ہونا کچھ عجیب ضرور ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کے متعلق جو رائے میں قایم کروں ٹھیک وہی رائے آپ کی بھی ہو۔

تاریخ کے اس حصہ کو اور خاص طور سے پوری تاریخ کو جو چیز نامکمل بنائے ہے وہ ہمارا اخلاقی نظام ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدروں میں تبدیلی سے ہماری ناواقفیت۔ ہمارا اخلاقی نظام بھی اور چیزوں کی طرح بورژوائی ہے جس کا معیار صرف چند چیزوں پر ہے۔ آدمی کو باعصمت ہونا چاہئے۔ آدمی میں سنجیدگی ہونی چاہئے۔ اسے صرف ثواب کمانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ گناہ کا خیال آتے ہی گویا انسان آدھا گناہ کر لیتا ہے۔ سچ بولو۔ جھوٹ سے پرہیز کرو۔ ہر وہ چیز جسے ہم تیری سمجھیں تیری ہے۔ بڑوں کا کہنا ماننا چاہئے عام اس سے کہ وہ غلط کہتے ہیں یا صحیح۔ یا پھر وہ چیزیں جو انسانی اخلاقیات کا بلند ترین معیار قرار دی گئی ہیں۔ گویا انسان کو فرشتہ ہونا چاہئے۔ دوسری بات جو ہمارے ذہن میں ہے وہ یہ کہ ہر اچھا آدمی بالکل اچھا ہے اور ہر برا آدمی بالکل برا۔ نہ اچھے آدمی میں کوئی برائی آسکتی ہے نہ برے آدمی میں کوئی اچھائی ہو سکتی ہے۔ زندگی کی قدریں جیسی بن گئیں ویسے ہی قایم ہیں۔ اس نظریہ سے بظاہر تو کوئی نقصان نظر نہیں آتا مگر غور کیا جائے تو ایک بڑی حد تک یہ نظریات ادیب کی فکر اور اس کی شخصیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہم اسی وجہ سے نہیں سمجھ پاتے، وہ سعدی جس نے گلستاں اور بوستاں میں ایسے بہترین اخلاقی نکات پیش کئے ہیں اسی سعدی نے اپنی اخلاقی تعلیم میں ایک باب (باب پنجم گلستاں) ایسا کیسے لکھ دیا جسے لوگ آج مخرب اخلاق سمجھتے ہیں یا میر نے:

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر — پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم
میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

یا شاہ آبر نے:

ہاں تلک خوش ہوں امرد سے کہ یارب کریم — کاش دے حور کے بدلے بھی تو غلماں مجھ کو
زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی سے — جہاں جاویں وہاں اک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں

جیسے اشعار کس ذہنی تحریک کے تحت میں لکھے۔ جب ہم ان چیزوں کو دیکھ کر تاریخ پر ایک تجسس آمیز نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں اس کی وجہ کہیں نظر نہیں آتی اور اگر کہیں کچھ ملا تو ایسی مبہم عبارت میں کہ وہ غزل کا شعر بن جاتا ہے جس کا اطلاق معشوق حقیقی و مجازی۔ سیاست۔ حقیقت۔ طریقت سب پر ہو سکتا ہے۔ یہ پردہ پوشی کچھ تو اس لئے ہوتی ہے کہ ہم نے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور زیادہ تر اس لئے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" چنانچہ ہم یہ جاننے کی

کوشش نہیں کرتے کہ عصمت اور منٹو صرف جنسیاتی حدود ہی میں کیوں چکر لگایا کرتے ہیں، کس لئے داغ کے یہاں عریانیت ہے اور کیوں جرأت کے یہاں لذتیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو درد کو صوفیانہ مسایل سے دلچسپی لینے پر مجبور کرتا ہے اور وہ کونسی چیز ہے جو نظیر اکبر آبادی سے جاڑے کا شباب دیکھ کر یہ کہلاتی ہے

جب ایسی سردی ہو لے دل تب روز مزے کی گھاتیں ہوں — کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
معشوق گلے سے لپٹا ہو، اور کہنی، چٹکی، لاتیں ہوں — کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہمارے مورخین کی یہ زبردست غلطی ہے کہ وہ فن کار کے عیوب پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی ادیب کی وہ ذہنی یا عصبی تحریک جسے مخرب اخلاق یا گناہ سمجھا جاتا ہے، اس پر کونسی ایسی روشنی ڈالی جائے کہ ابہامات اور گتھیاں جنسے بعض اوقات ہم سمجھنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ہمارے سامنے آئینے کی طرح روشن ہو جائیں۔ ادیب میں انفرادیت کا جزو کم اور اس کی زندگی کی الجھنوں یا خوشگوار لمحوں کا بڑا حصہ ہوا کرتا ہے اور یہی چیز کبھی کبھی انفرادیت نظر آنے لگتی ہے۔

یہ ایک بورژوائی ذہنیت رہی ہے کہ آرٹ کو ہم نے یا تو انفرادی چاہا یا روایتی۔ درانحالیکہ آرٹ نتیجہ ہے آرٹسٹ کی انفرادیت اور اس کے گرد و پیش کے ماحول سے تصادم کا اور یہی وہ ٹکریں ہیں جو آرٹسٹ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ آرٹ کو محض آرٹ کے لئے خلق نہ کرے بلکہ عینیت پرستی سے پیچھا چھڑا کر ایک عام انسان اور اس کے زندہ رہنے کی جدوجہد جو زندگی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُسے آرٹ کے ساتھ پیش کرے۔ ہمارے قدیم فنکار اس میں شک نہیں بڑی حد تک فن برائے فن کے حامی رہے مگر ہمیں ان کی تخلیق پر نظر ڈالتے وقت ان کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ خواہ انھوں نے ایسا شعوری طور پر کیا یا غیر شعوری طور پر، مگر اس میں ان کے ماحول اور ان کی کشمکشوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے روایت سے خوب کام لیا جس سے ہمیں ان کی زندگی کے سمجھنے میں سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کے افکار ان کی زندگی پر قطعیت کے ساتھ کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ وہ یکسانیت کے رنگ میں اتنے گہرے رنگے ہوئے ہیں کہ آپ کلام سے ہرگز پتہ نہیں لگا سکتے کہ کسے واقعی عشق تھا اور کون محض رسم نباہ رہا ہے سب کے جذبات اور حسیات میں یکسانیت ملے گی، وصل و وصال ایک ہی طریقہ پر ہوگا۔ ہجر میں سب کو ایک ہی طرح کی دشواریاں پیش آئیں گی سب کا معشوق بے وفا ہوگا۔ وعدہ شکن ہوگا۔ سب کا سراپا ایک ہوگا۔ سب خوبصورتی کا مثالی نمونہ ہوں گے۔ یہ ایسی دقتیں ہیں جن کی بنا پر ہمارے مورخین جو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی صحیح طور پر شاعر کو نہیں سمجھ پاتے مگر کچھ یہ بھی ہے کہ ہمارے مورخین زیادہ تر ایک ہی لکیر کو پیٹتے آئے ہیں اور وہ لکیر "فن" ہے۔

تاریخوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مورخین[1] کے سامنے کسی شاعر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت صرف ایک ہی چیز پیش نظر رہتی ہے اور وہ یہ کہ فنکار نے کہاں تک فن کی تکمیل کی ہے اور فنی اصولوں کو اس نے کہاں تک نبھایا ہے۔ کہاں اضافت کی غلطیاں ہیں۔ کہاں حروف گرتے ہیں، کہاں شتر گربگی پیدا ہوتی ہے مصرعہ کا رخ کیا ہے۔ کون کون سی رعایتیں ہیں۔ کہاں روانی ہے۔ کہاں سلاست ہے۔ واردات قلبی کا بیان مکمل اور جامع ہے یا نہیں۔ یہ چند چیزیں ہیں جنھیں ہمارے مورخین اور رجعت پسند نقاد منتروں کی طرح دہرایا کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ ذہنیتیں چاہتی ہیں کہ ہر ادیب۔ ہر فن کار کا وہی نقطۂ نظر وہی معیار ہو جو ابھی تک شاعروں اور ادیبوں کا ہوتا آیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر دوسرے دور کا ادیب یا شاعر اپنے پہلے دور کے ادیب یا شاعر کی طرح کیوں سوچے یا اس کے نظریات بھی وہی کیوں رہیں۔ کروچے (CROCE) کا کہنا ہے کہ آرٹ الہام ہے اور الہام انفرادیت اور انفرادیت دہرائی نہیں جا سکتی۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر کس طرح ایک انفرادی خصوصیت جو آپ کو پسند ہے اور جو پچھلی صدی میں موجود تھی۔ آج کے فن کار سے بھی آپ اسکے طالب ہوں۔ ہم ایسے تقاضے کرتے وقت گویا مادے کے حرکی ہونے اور زمانہ کی رفتار کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ گویا ہم چاہتے ہیں کہ آرٹ جس طرح بھی خام یا پختہ شکل میں ظہور پذیر ہوا بس اُسی طرح قایم رہے اور اگر بڑھے تو انھیں اصولوں پر اور اس طرح ہم ہمیشہ عمر رفتہ کو آواز دیتے رہیں۔ ہمارے مورخین کو اس سے قطعاً غرض نہیں ہوا کرتی کہ فن کار کہاں تک اپنی سماجی ضرورتیں اور دقتیں پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے اور کہاں اس نے چشم پوشی کی ہے اور

---

[1] عموماً ادب کا مورخ نقاد بھی ہوتا ہے۔

آیا یہ چشم پوشی کسی جبر کے باعث ہوئی ہے یا ادیب کی ذہنیت ہی میں فرسودگی اور خوشامد کا انداز آگیا ہے۔ یا اُسے ان ضرورتوں سے انکار ہے یا وہ آرٹ کو محض خود غرضی بنانا چاہتا ہے۔ کہاں اس نے ضمیر فروشی کی ہے اور کہاں اس سے ضمیر فروشی کرائی گئی ہے۔ ایک مورخ ان سب باتوں کو واضح طور پر پیش نہیں کر رہا ہے تو وہ مورخ تو ہے مگر ادب کا مورخ ہرگز نہیں۔

"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" سے بہت کچھ ملتا جلتا ہمارے مورخین کا ایک اور رجحان ہے جسے "عطائے خرداں" شخصیت یا ہیرو پرستی کہہ لیجئے۔ ہمارے مورخ اس کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور اسی سے ایک اور شاخ پھوٹتی ہے وہ ہے شخصیت دشمنی۔ مورخ کسی سے یا تو بے انتہا متاثر ہوتا ہے یہاں تک کہ اُسے اس فن کار میں کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی اور اگر کوئی کمی ہے تو اُسے بھی خوبی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یا پھر کسی فن کار سے مفت میں دشمنی مول لے لی جاتی ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی خوبیوں کو بھی اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ خرابی معلوم ہوں۔ اس کی بیّن مثال 'آب حیات' میں ذوق و غالب کا تذکرہ۔ موازنۂ انیس و دبیر اور یادگار غالب (گو یہ دونوں کتابیں تاریخیں تو نہیں مگر واقعات ان میں تاریخی حیثیت ہی سے بیان کئے گئے ہیں) ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ہیرو پرستی کا شکار ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ جو تاریخیں ان کے بعد مرتب ہوئیں وہ بھی ان سے متاثر ہیں اور اسی طرح کے بے سر و پیر واقعات اور غیر تحقیقی قصوں کا ایک ذخیرہ ان میں بھی موجود ہے۔

تاریخ۔ خصوصاً ادب کی تاریخ صرف واقعات کا مجموعہ ہرگز نہیں بن سکتی۔ مورخ کو انسان کے ارتقائی مدارج اور ارتقائی جد و جہد کو اچھے اور واضح طریقے سے سمجھنا بہت ضروری ہے جو مورخ کو واقعات کے ساتھ ملا کر ایک صحیح شکل کے مرتب کرنے میں مدد ثابت ہو اور اگر وہ انسان کے اجتماعی، اقتصادی، اور ثقافتی ارتقاء سے بہ خوبی واقف نہیں ہے تو وہ ہرگز ایک مورخ نہیں بن سکتا۔ عملی طریقے سے انسان کی ترقی مادی ہی ہو سکتی ہے چاہے وہ اقتصادیات میں ہو چاہے کلچر میں۔ اور یہی ایک ایسی ترقی ہوگی جس کی منزل ایک معلوم منزل ہوگی۔ تصور پرستی نہ تو ترقی ہو سکتی ہے اور نہ انسانی جماعت اس سے مستفید ہو سکے گی۔ ہمارے مورخ زیادہ تر اسی کمزوری کا شکار ہیں۔ ان کے نظریات بھی زیادہ تر عینی ہیں۔ نہ وہ مادہ کی گوناگوں صلاحیتوں سے واقف ہیں اور نہ اس کے کرشمے کو انسانی ترقی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کا میلان بہت کچھ تصور پرستی کی طرف ہے جس میں ترقی کے صرف چند محدود اصول مل سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ عینی اصول عمل کے میدان میں بالکل بے کار ثابت ہوں گے۔ نتیجہ کے طور پر مورخین یا تو ان کے موافق رائے دیتے ہیں جنھوں نے تصور پرستی سے کام لیا ہے اور جسے تخئیل کی بلندی کہا جاتا ہے یا پھر ان کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کریں گے جو تصور کی چوٹیوں پر نہیں پہونچ پاتے اس لئے کہ وہ عمل کے میدان میں چل رہے ہیں۔

آج جدید ادب کا ترقی پسند حصہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا حامل ہے اور بعض ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جن سے ابھی لوگ واقف بھی نہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ لوگ جس طرز پر یہ بیانات چاہتے ہیں، ہمارا طرز اظہار اس سے الگ ہے۔ آپ فن چاہتے ہیں اور صرف فن۔ اور آج وہ آرٹ جسے پروپیگنڈا کہا جاتا ہے۔ اس میں احساس کی تلخی اتنی اُبھری ہوئی ہے کہ بعض اوقات ہمارے مورخین اور رجعت پرست نقادوں کے نزدیک فن کا خون ہو جاتا ہے اور جس کا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ جد و جہد میں کسے رکھ رکھاؤ کا خیال رہ جاتا ہے۔ یہ لوگ شاید اس نقطہ سے واقف نہیں کہ انقلابی دور کا آرٹسٹ صرف آرٹسٹ نہیں رہ سکتا۔ اُسے ملہم۔ مفکر۔ سیاست داں۔ سبھی کچھ ہونا پڑتا ہے۔ انقلابی دور کا یہ خاصہ ہوا کرتا ہے اس کے علاوہ زندگی حرکی ہے اور انقلاب ایک زبردست حرکت۔ آرٹسٹ ایک مقام پر جامد ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اُسے یا تو آگے بڑھنا ہوگا یا پیچھے ہٹنا ہوگا۔ بین بین چلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سید محمد عقیل

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان و تخئیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار

اسداللہ خاں تمام ہوا !

ایک سوانحی تمثیل

غالب کی زندگی اپنے آغاز و انجام اور درمیانی واقعات کی ترتیب و ارتقا کے لحاظ سے ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے - دنیائے شعر میں تو مرزا غالب خلاق معانی اور فنکار تھے ہی، لیکن اُن کی شخصی زندگی کے مرقع کو بھی رنگ اور روشنی اور سائے کی آمیزش نے ایک مستقل فنی کارنامہ بنا دیا ہے - غالب کی زندگی کا پورا ڈراما تخیل کی ذرا سی کوشش سے ہم پر خود بخود منکشف ہو جاتا ہے - یہ ڈراما سلطنتوں کے ہبوط و زوال، عظیم الشان اخلاقی و دینی قوتوں کی پیکار اور مشرق و مغرب کی فیصلہ کن آویزش کے پس منظر پر نمودار ہوتا ہے - غالب کے سوانح حیات کا قاری صرف یہ کرتا ہے کہ نصف صدی کے واقعات کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اپنے فنی شعور کے دایرے کے اندر لے آتا ہے اور پھر یہ حیرت انگیز ڈراما خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے -

مرزا غالب نے اکھتر برس کی عمر پائی - اُن کا زمانۂ حیات مسلمانان ہند کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا - جنوب سے مرہٹوں، مغرب سے سکھوں، مشرق سے انگریزوں نے مغلوں کی سیاسی طاقت پر پے در پے حملے کئے لیکن مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا ایک ننھا سا نقطہ پھر بھی ہندوستان کے قلب میں روشن رہا اِس روشن نقطے کا نام تھا دلّی - اُنیسویں صدی کی دلّی میں اہلِ کمال کا ایک ایسا مجمع نظر آتا ہے، جس سے اکبری اور شاہجہانی عہد کے علم و فضل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے - اہلِ کمال کی اس جماعت پر نظر ڈالئے تو بزرگوں میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور مولوی امام بخش صہبائی، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن اور نوجوانوں میں سید احمد خاں اور حالی، ذکاءاللہ اور نذیر احمد کے پائے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں -

اِسی دلّی میں ۱۸۳۰ء کے موسمِ گرما کا ذکر ہے کہ ایک دن سہ پہر کے وقت مرزا اسداللہ خاں غالب کے مکان کے باہر - - - - - - - - - -

ایک خوش الحاں فقیر:- کنکر چُن چُن محل بنایا مور کہے گھر میرا ہے
ناگھر میرا، ناگھر تیرا، چڑیا رین بسیرا ہے
ناگھر میرا، ناگھر تیرا - - - - - - - - - - (آواز دور ہوتی جاتی ہے)

(گھر کے اندر بیگم غالب تخت پر بیٹھی ہیں - صحن میں بیری کے درخت سے طوطے کا پنجرا ٹنگا ہے)

بیگم غالب - ددا! اے ددا! ذرا اُٹھیو جلدی سے - لیجیو - یہ ادھنا دروازے تک جا کر بچارے کو دے آئیو - (ددا جاتی ہے) — (ایک آہ سرد کے ساتھ تاسف آمیز لہجے میں آہستہ) چڑیا رین بسیرا! چڑیا کے بھاگ پھر اچھے کہ اپنے گھونسلے میں تو بیٹھی ہے اور میں، نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی! — غریب کے سر پر بھی اپنا جھونپڑا ہوتا ہے، لیکن میرے لئے دلّی میں کرائے کے مکانوں کے سوا اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا - ابّا جان نے آنکھیں کیا بند کیں، میرے نصیب سو گئے - چار سال سے چولھا اُٹھائے گھر گھر پھرتی ہوں - اب برسوں کے رکھے ہوئے، زربفت اور کمخواب کے جوڑے بھی ایک ایک کر کے بکنے لگے - یہ کلکتہ کا سفر مجھے تو بہت مہنگا پڑا - کیا کیا امیدیں لے کر مرزا صاحب روانہ ہوئے تھے، اور پھر کس حال میں واپس ہوئے! اب چھ مہینے بعد بھی کبھی کوئی نیک خبر کلکتہ سے نہیں آئی - (ذرا بلند آواز سے) ددا! مدار خاں سے کہیو مرزا صاحب سے پوچھے کہ ٹھنڈائی دیوان خانے میں پئیں گے یا - - - - کیا کہا؟ - آرہے ہیں؟ تو بس ٹھیک ہے — (طوطا بولتا ہے)

لو۔ اب میاں مٹھو کو تھوڑی سی چوری دے دو۔ (مرزا غالب آتے ہیں)

غالب — چڑیا رین بسیرا۔ آپ نے بھی یہ وعظ سُنا ہے لیکن زندگی کتنی ہی بے ثبات ہو اس کا یہ مرتبہ تو دیکھئے کہ اس پر وعظ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (طوطا پھر بولتا ہے) کہو میاں مٹھو! اب کیا فریاد ہے! آج چوری نہیں ملی؟ اے میاں خوش رہو۔ نہ تمھارے بچے نہ جورو، چوری کھاؤ اور مزے کرو۔ یہی زندگی ہے

بیگم — اِن باتوں سے کیا فایدہ ؟ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری اپنی زندگی کیسی ہے ؟

غالب — اچھی اور بُری اور اچھی !

بیگم — اب یہ پہیلیاں بھلا کون بوجھے ؟

غالب — بات تو صاف کہتا ہوں۔ سب سے پہلے اچھی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شروع میں برسوں تک زندگی خوب گزری۔ پھر بُری اس لئے کہ پچھلے چار پانچ برس سے ہم لوگ چکر میں ہیں اور پھر دوبارہ اچھی اس لئے کہ مقدمے کا فیصلہ ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بیگم — میں تو پانچ سال سے انھیں امیدوں پر جی رہی ہوں !

غالب — تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ بھی ہو، سرکار انگریزی نے پچیس برس پہلے ہم دونوں بھائیوں کے لئے دس ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر کی شمس الدین خاں نواب ہیں، تو فیروز پور جھرکہ کے ہیں، میرے سرکاری وظیفہ کے نواب نہیں ہیں۔ نہ اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے اس دس ہزار کو پندرہ سو کون بنا سکتا ہے ؟ سرکاری شقے کسی کی جعل سازی سے بدل نہیں جاتے۔ یہ رقم مل کر رہے گی، بلکہ اگر انصاف ہوا تو اب تک جس قدر کم رقم ملتی رہی ہے۔ اُس کی واصلات ابتدا سے آج تک دلوائی جائے گی۔

بیگم — (زہر خند سے) انصاف ! میں نے صرف اس کا نام سُنا ہے۔ انصاف کرنے والے حاکم بدلتے ہیں۔ معزول ہوتے ہیں، مرتے ہیں مگر انصاف نہیں ہوتا۔

غالب — انصاف ہوگا !

بیگم — نہیں ہوگا ! ایسے انصاف کو میں کیا کروں جس کے انتظار میں ایک بھائی پاگل ہو گیا اور دوسرا —

غالب — اور دوسرا ؟

بیگم — اور دوسرا اٹ گیا۔ چکی کے دو پاٹوں تلے پس کر رہ گیا۔

غالب — میرا پس جانا کچھ ایسا آسان نہیں ہے۔ چکی کے پاٹ البتہ گھس گئے ہیں۔ ابھی اور گھسیں گے۔

(باہر کے دروازے پر دستک۔ مدار خاں ملازم آتا ہے)

مدار خاں — سرکار ! مولانا فضل حق صاحب کا آدمی یہ رقعہ چھوڑ گیا ہے۔

غالب — مولانا کو آہ خود یہاں آنا تھا — خیر لاؤ۔ رقعہ — (رقعہ کھولتے ہوئے) اچھا! کروڑی مل مہاجن کو میرے خلاف ڈگری مل گئی۔ ہوں ! کہ ڈگری مل بھی کیا کرے، کلکتہ جانے سے پہلے اُس سے قرضہ لیا تھا۔ اب کروڑی مل اور دیوانی عدالت کا پیادہ میری تلاش میں منڈلا رہے ہیں۔

بیگم — اب کیا ہوگا ؟

غالب — ہوگا کیا، گھر میں بیٹھوں گا۔ (طوطا بولتا ہے) میاں مٹھو سے باتیں کروں گا۔ آپ کی نمازیں حارج ہوں گا۔ دستور کے مطابق شرفا کو دیوانی عدالت کے ڈگریدار گھر کے اندر تو گرفتار کر نہیں سکتے، اور دن کے وقت میں باہر نکلنے سے رہا (ذرا ہنس کر) دونوں وقت ملتے جب چراغ میں بتی پڑتی ہے میں بھی چوکا دڑوں کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے نکلا کروں گا، اور باہر کا کام دھندا کر آیا کروں گا — مدار خاں ! دیکھو سرس کی لگی جاؤ — جو چھینٹ میں نے آج فرغل کے لئے خریدی تھی وہ عزیز النساء خانم میری بھتیجی کو دے آؤ (بیگم سے ذرا دھیمے لہجے میں) وہ بچی نئے کپڑے کو ترس گئی ہے — اور دیکھو ! یوسف بیگ خاں کا حال پوچھنا اور کہ آتا کہ میں آج حکیم صاحب کو نہیں لاؤں گا۔ ہاں کل مغرب کے بعد انھیں ساتھ لے آؤں گا (مدار خاں جاتا ہے) بچارا یوسف ! ہمارے لڑکپن میں لوگ کہا کرتے تھے کہ دونوں بھائیوں میں وہی کماؤ ہوگا۔ کیا بدن تھا جیسے لوہے کی لاٹھ! اور جب حیدر آباد سے اپنے سالے کو چھوڑ کر آیا تو دیکھ کر دل کانپ جاتا تھا — مجذوب، مخبوط، ٹوٹی ہوئی کمان کی طرح بے حال! اگر اُس کا

حال ٹھیک ہوتا تو میں اس مقدمے کے لئے شاید اُسی کو کلکتہ بھیجتا۔

بیگم — اُف کلکتہ کے نام سے میرے سینے میں ایک تیر لگتا ہے۔ اس کلکتہ کی امید نے ہمیں ویران کر دیا۔ ورنہ لکھنؤ کے دربار سے کچھ نہ کچھ مل گیا ہوتا۔

غالب — (ذرا تلخی سے) تمھیں لکھنؤ کے دربار کا حال کیا معلوم ؟ روشن الدولہ کے ہاتھ دو چار ہزار کے عوض اپنی آبرو بیچ ڈالتا ؟ وہ اگر نائب السلطنت تھا، تو میں بھی خاندانی شریف تھا۔ وہ میری تعظیم دینے پر کیوں آمادہ نہ ہوا ؟ کیا اُس کے لئے یہ کافی نہ تھا کہ میں نے اُس کی مدح میں ایک نثر طیار کی ؟ اس کے ساتھ یہ شرط کیوں لگائی گئی۔ کہ گداگروں کی طرح نذر بھی پیش کروں ؟ میں نے فوراً کہا کہ میں ایسی حضوری سے معافی چاہتا ہوں۔

بیگم — اچھا ہمارا مقدر !

غالب — جو کچھ مقدر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ ہم اگر شکوہ کریں بھی تو کیا حاصل ؟

بیگم — ہاں تمھارے لئے سب کچھ آسان ہے۔ اور نہیں تو شعر لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لی۔

غالب — آپ کے آنسوؤں سے بھی تو دل کی بھڑاس خوب نکل جاتی ہے !

بیگم — (دردناک آواز میں) تو کیوں نہ روؤں ! باپ مر گیا۔ بھائی سے تمھاری ان بن ہو گئی۔ مکان بک گیا۔ گھر میں جو زیور یا کپڑا تھا وہ بھی یہ جاگیر کا مقدمہ کھا گیا۔ اب تمھارے پیچھے عدالت کے پیادے قید کرنے کو پھرتے ہیں — بچے تھے ..... (بھرائی ہوئی آواز میں) وہ مر کر مجھے جس سناٹے میں چھوڑ گئے میرا ہی دل جانتا ہے (سسکیاں لے کر روتے ہوئے) کیسے پیارے بچے تھے جیسے چاند کے ٹکڑے، ابھی تتلانا ہی شروع کیا تھا کہ اللہ کو پیارے ہو گئے (روتے ہوئے) ایک ایک کر کے سب گئے۔ پہلا .... اور دوسرا، پھر تیسرا بھی .... چوتھا بھی۔ (مختصر وقفہ)

غالب — (آہستہ سے) دوا کیا زین العابدین خاں آج اِدھر نہیں آیا ؟ میں نے صبح اُس سے کہا تو تھا کہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اپنی خالہ کے پاس ہو جایا کرو.... بڑا نیک بخت لڑکا ہے کسی کام کی وجہ سے رُک گیا ہو گا۔ دیکھو صبح اُن کے ہاں جانا اور کہنا میاں بھول کیوں گئے ؟ تمھاری خالہ تنہائی میں کڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں آؤ گے، کچھ میں تمھیں پڑھا دوں گا۔ کچھ تمھاری خالہ تم سے باتیں کریں گی اِن کا جی بہل جائے گا.... اور بیگم اب جلد ہی ہمارے دن پھریں گے۔ میرے کاغذات گورنر جنرل کے سامنے عنقریب پیش ہوں گے۔ انگریز سکریٹری میرا دوست ہے۔

بیگم — ہاں مگر سال بھر پہلے وہ بھی تو تمھارا دوست تھا۔ دلی کا انگریز ایجنٹ .....

غالب — کول برُک ؟

بیگم — جو معزول ہو گیا۔ خیر پھر تم نے دل کو یوں تسلی دی کہ اس کی جگہ دوسرا انگریز دوست آ گیا۔

غالب — ہاں ہاں فریزر۔

بیگم — لیکن فریزر چھ ہفتے کے اندر بدل گیا اور اس کی جگہ نیا ریزیڈنٹ آیا جو تمھارا نہیں، شمس الدین خاں کا دوست ہے۔

غالب — تو کیا ہوا ہر بار ایسے ہی اتفاق تو پیش نہیں آئیں گے۔ نہ ہاکنز کی روداد پر آخری فیصلہ ہو جائے گا۔ کلکتہ میں لاٹ صاحب کا سکریٹری اسٹرلنگ صاحب میرا مخلص اور بہی خواہ ہے۔ کیا خوب آدمی ہے۔ پہلی ملاقات پر شریفوں کی طرح اُٹھ کر مجھے تعظیم دی۔ اپنے ہاتھ سے عطر اور الائچی پیش کی اور بعد میں بھی ہمیشہ تکریم سے پیش آتا رہا۔ میرے کاغذات اُسی کے ہاتھ سے نکلیں گے۔ پھر ابھی چند سال وہ اپنی جگہ سے ٹل بھی نہیں سکتا۔ اس لئے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسٹرلنگ، کلکتے میں ہے تو سب ٹھیک ہے۔ (باہر کے دروازے پر دستک)

بیگم — یا الٰہی خیر ! اب یہ کون آیا ؟

غالب — کوئی نہیں، مدار خاں واپس آیا ہو گا۔ (مدار خاں آتا ہے)

مدار خاں — سرکار صدر الصدور صاحب کا آدمی میرے ساتھ ہی پہونچا اور یہ پرچہ دے گیا۔

غالب — آج سب دوستوں کی طرف سے ایک ایک رقعہ ضرور آئے گا۔ لاؤ دیکھیں کیا کہتے ہیں مفتی صدر الدین خاں صاحب (کاغذ کھولتے ہیں)

بیگم — خدایا کوئی خیر کی خبر دیجو !

غالب — کلکتہ سے ..... خبر آئی ہے ..... اسٹرلنگ صاحب ۲۳ مئی کو مر گئے ——— ہائے جواں مرگ !

یہ مرزا غالب کی زندگی کا ایک رُخ تھا۔ لیکن اس ذاتی اور خانگی پریشانی کے علاوہ اُن کی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی تھے۔ ان پہلوؤں کا تعلق اُن کے روشن ضمیر دوستوں کی صحبت اور اُن کی بڑھتی ہوئی شاعرانہ شہرت سے تھا۔ لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل نے مقدمہ کا فیصلہ اُن کے خلاف کیا۔ کچھ پرانی پریشانیوں میں کمی ہوئی، کچھ نئی پریشانیوں کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح اور بارہ سال گزر گئے۔ اس زمانہ میں ایک صبح کا ذکر ہے کہ مولانا فضلِ حق خیر آبادی مرزا غالب کے مکان پر پہونچے۔

مولانا — ارے بھئی مرزا، اب اُٹھو اور خدا کا نام لو۔ مردِ خدا یہ بھلا سونے کا وقت ہے ؟ میں دو گھڑی تم سے بات کرنے آیا تھا اور تم ہو کہ شرابیوں کی طرح صبح کے وقت غافل پڑے ہو۔

غالب — یہ جو آپ نے مجھے شرابی سے تشبیہ دی، اِسے اصطلاح میں تشبیہ تام کہتے ہیں۔

مولانا — اب آپ علم معانی پر اپنا درس رہنے دیجئے اور ذرا اُٹھ کر ہاتھ منھ دھو لیجئے۔

غالب — بھئی مولانا، مجھے اتنی مہلت تو دو کہ تمھاری تشریف آوری پر ذرا خوش ہو لوں۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ قلعۂ معلّٰی سے چوبدار نے آکر خبر دی کہ جہاں پناہ نے یاد فرمایا ہے سو اسی خواب کی تعبیر تمھاری ملاقات ہے ؎

جہانے مختصر خواہم کہ دردے ہمیں جائے من و جائے تو باشد

کلّو آفتابے میں پانی لاؤ۔ ذرا منھ بھی دھو لیں اور باتیں بھی کرتے جائیں۔ اور دیکھو مولانا کے لئے شربت بھی لاؤ۔ مولانا، یہ پیشگاہِ حضور میں طلبی کا خواب کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کبھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں۔ میاں ابراہیم خاقانیِ ہند حسبِ معمول اس پر جز بز ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ سلامت کو اس طرف توجہ ضرور ہو گئی ہے۔ خیر یہ قصہ تو پھر سناؤں گا، آپ کہئے کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔

مولانا — بھئی پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، یہ غیر مقلدین کا فتنہ کسی طرح فرو ہونے نہیں آتا۔

غالب — میں تو آپ کے مقلدین میں سے ہوں۔ یوں کہ منھ دھوئے بغیر دین کی بات نہیں کرتا۔ لیجئے یہ شربت نوش فرمائیے اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

مولانا مرزا، اِس پیالے میں سے دو ایک گھونٹ پہلے تم پیو !

غالب — یہ کیوں ؟

مولانا — اس لئے کہ تمھاری زبان کا اثر میری زبان میں آجائے۔

غالب — مولانا، اگر ایک رندِ گناہگار کو یوں کانٹوں میں گھسیٹو گے تو میں اُٹھ کر تمھارے قدموں کو چھو لوں گا۔ میرے لئے یہ سعادت کم نہیں کہ میں اور تم ایک ہی سال پیدا ہوئے اور تم نے جوانی سے لیکر اس عمر تک جس طرح میری رہنمائی کی ہے .....

مولانا — تو بھئی مرزا ! اُس رہنمائی کے بدلے اب کچھ میری رہنمائی کرو۔ وہی مسئلہ امتناعِ نظیر خاتم النبیین ..... اس پر اپنا اور وہابی جماعت کا اختلاف مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تم میرا یہ عقیدہ جانتے ہو کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے یعنی جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کو اصرار ہے کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اسلئے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ اس لئے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مرزا تم ذرا غور کرو کہ کیا یہ بالواسطہ ختمِ نبوت سے انکار نہیں ہے ؟

غالب — ہے، مگر مولانا اگر خدا لگتی سنو تو میں یہ کہوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ذاتِ باری کی قدرتِ کاملہ سے انکار ہے، شاہ اسمٰعیل کے پیرو اس پر چراغ پا نہ ہوں تو کیوں ؟

مولانا — ارے میاں ! یہ کیا کفر بکنے لگے ہو ؟ کون خدا کی قدرت کاملہ کا منکر ہے۔ تمھارے نزدیک تو اللہ تعالےٰ کی قدرت کا اظہار صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے قوانین کو خود ہی توڑے، حالانکہ اس طرح اُس کی قدرت محدود ہو جاتی ہے۔ میرے رسالہ بحثِ "قاطیغوریاس" میں

یہ ذکر موجود ہے۔ ہاں جس کی طبیعت معقول کے بجائے غیر معقول کی طرف راغب ہو، اس کا راستہ مجھ سے جدا ہے۔ (ذرا ٹھہر کر) تو میں آج اسلئے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم سے ایک مبسوط اور مدلل مثنوی لکھنے کو کہوں جس سے نظیر خاتم النبیین کا امتناع ثابت ہو۔ کاش مجھے بھی بیان پر وہی قدرت حاصل ہوتی جو تمھیں ہے تو میں یہ خدمت انجام دیتا۔

غالب — مولانا! یہ معاملہ نازک ہے اور شعر و حجت کو جمع کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل ناگزیر ہے۔ میں اس باب میں ضرور فکر کروں گا۔ اب کہو تو مصطفےٰ خاں کے ہاں چلیں۔ وہاں آج صدر الصدور صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ شاید مومن خاں بھی ہوں

مولانا — تو آؤ چلیں، میری پالکی باہر موجود ہے۔

غالب — بس میں ذرا کان میں دوا ڈال لوں۔

مولانا — کیوں خیریت تو ہے؟

غالب — کچھ دنوں سے اونچا سننے لگا ہوں۔ اِس سے گھبراتا ہوں ——— حکیم صاحب نے مسہل پلا کر تنقیہ کیا۔ اس کے بعد ہفتہ بھر عرق اتار ترش اور روغن گل مساوی ملا کر چند قطرے نیم گرم — کان میں ٹپکاتا رہا۔ کل سے آب برگِ شفتالو نیم گرم ٹپکا رہا ہوں۔ ابھی تک کچھ افاقہ نہیں ہوا

مولانا — یہ تشویش کی بات ہے۔ تمھاری تمام دُنیا تو بس یہی چشم و گوش کی دُنیا ہے۔

غالب — کئی برس ہوئے، میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یوں ہے:۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — وہ جنتِ نگاہ یہ فردوسِ گوش ہے

اب اِس فردوسِ گوش سے نکلنے کا تصور مجھے اُسی طرح مضطرب کر دیتا ہے جس طرح آدمِ اول کو فردوسِ بریں سے نکلنے کا خیال..... لیجئے دوا تو کان میں پڑ گئی آیئے اب چلیں۔

اس طرح یہ دونوں ہم عمر، ہم مذاق، ہم علم دوست باتیں کرتے ہوئے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکان تک پہونچے نواب صاحب کے دیوان خانہ میں مجلس احباب جمی ہوئی تھی۔ گانا ہو رہا تھا اور ایک غزل ابھی ختم ہوئی تھی۔ مرزا غالب اور مولانا فضل حق کو سازوں کی موسیقی کے ساتھ صرف آخری لفظ "ایسی" کی گونج سنائی دیتی ہے۔

شیفتہ — (دونوں دوستوں کو آتے دیکھ کر) آیئے مرزا صاحب، آیئے مولانا، تشریف لایئے۔ میری آنکھیں تو دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور مولانا صدر الدین خاں آزردہ بھی کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ مفتی صاحب! یہ لیجئے آخر آ ہی پہونچے مرزا نوشہ۔

آزردہ — اور مرزا نوشہ کے مرزا شہ بالا بھی تو ساتھ ہیں۔ بہت خوب، خوش آمدید!

شیفتہ — افسوس صرف اتنا ہے کہ آپ مفتی صاحب کی ایک مرصع غزل سے محروم رہے۔ مفتی صاحب کم گو ہیں اور نغز گو۔ کاش آپ آجاتے اور سنتے۔

غالب — تو آپ میری موجودگی کو عدم موجودگی سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں۔ مجھے وقت کی رعائی مقرر نہ فرمایئے کہ ابھی ہوں اور ابھی نہیں ہوں۔ (ہنس کر) ع
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

مولانا — مفتی صاحب یہ بڑا ظلم ہوگا اگر ہم محروم رہ گئے۔

آزردہ — صاحب غزل مختصر ہے اور اس میں بھی کام کے شعر بس دو ہیں۔ آپ کو اصرار ہے تو میں خود ہی سنائے دیتا ہوں۔

مولانا — ارشاد۔

آزردہ — ؎ کھڑا وہ بلا، زلفِ سیہ، فام وہ کافر — کیا خاک جیئے جس کی شب ایسی، سحر ایسی

("واہ واہ، مرحبا، کیا شعر ہے" کا شور۔ آزردہ دوسرا شعر پڑھنے سے پہلے یہ مصرعہ دہراتے ہیں۔ ع کیا خاک جیئے جس کی شب ایسی سحر ایسی۔ اور پھر یہ شعر پڑھتے ہیں) ؎ یا تنگ نہ کر ناصحِ ناداں مجھے اتنا — یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی (پھر داد کا شور)

مولانا — کیا اچھوتا انداز ہے! اور پھر یہ زمین! مفتی صاحب یہ زمین کہاں سے پائی؟

غالب — کہاں سے پائی؟ ارے بھائی آسمان سے اور کہاں سے!

شیفتہ — صاحبو پان اور شربت حاضر ہے!

غالب — میں تو شربت پیوں گا — اس شربت کا رنگ مجھے پکار پکار کر بلا رہا ہے ۔۔۔۔ مولانا! آپ کیوں للچائی ہوئی نظروں سے میرے صدقے قربان ہوئے جاتے ہیں۔ آپ کو اس شربت کا ایک گھونٹ نہیں ملے گا۔ (دوستوں کا قہقہہ)

آزردہ — ہاں صاحب میں ذکر کرنے والا تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کو دلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہے۔

مولانا — مفتی صاحب یہ دلی کالج کا نیا انتظام کہیں ویسا ہی نہ ہو جیسا سات آٹھ برس پہلے تاج محل کے لئے تجویز کیا گیا تھا

شیفتہ — کیا کہنے ہیں تاج محل کے! آگرہ اس ویرانی پر بھی ایک مرقع غزل ہے۔ مگر بیت الغزل تاج محل ہے۔

مولانا — یہ تو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کہتے ہیں نا۔ انگریزوں کی قدر دانی ملاحظہ فرمایئے کہ لارڈ ولیم بنٹنگ نے تاج محل کا تمام سنگ مرمر اُکھڑوا کر فروخت کر دینے کی تجویز کی اور بچاؤ اس طرح ہوا کہ پہلے اُکھڑوائی کا اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خرچ زیادہ ہوگا اور آمدنی کم۔

غالب — مولانا عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو! لیکن آپ تو انگریزوں کی نفرت سے اُبلے پڑتے ہیں، آپ کیا انصاف کریں گے!

مولانا — نہ مانو، مگر میری یہ بات یاد رکھو کہ اگر انگریزوں کو خدا اختیار دے تو تاج محل اور لال قلعہ میں گدھے بندھوا دیں۔ جامع مسجد کو اپنا اصطبل بنالیں۔

آزردہ — تو مولانا آپ خدا سے سفارش کیجئے کہ انگریزوں کو اختیار نہ دے۔ مجھے تو انگریزوں کے اختیار میں فی الحال کوئی کمی ہوتی نظر آتی نہیں۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ٹامسن صاحب آگرہ سے دلی آئے ہیں۔ دلی کالج کے لئے سو روپے مہینے پر فارسی کے استاد کا تقرر ہو رہا ہے۔ میں نے مرزا نوشہ سے پوچھے بغیر ان کے لئے تحریک کرا دی ہے۔ مشاہرہ نہایت معقول ہے اور یہ جگہ مرزا صاحب کے لئے مناسب بھی معلوم ہوتی ہے۔

غالب — (ہنس کر) شکر ہے میری شاعری نہیں تو میری زبان دانی آپ کے نزدیک مسلم ہو گئی۔ یہ منصب واقعی میرے لئے نہایت مناسب اور نہایت نامناسب بھی۔

شیفتہ — مرزا صاحب للہ اس باب میں یوں شاعری نہ فرمایئے یہ تقرر اگر ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔

غالب — لیکن صاحب! میں کیا کروں، کل میری شاعری اس تقرر کا قصہ پاک کر بھی آئی۔

شیفتہ و آزردہ — (چونک کر) یعنی؟

غالب — یعنی یہ کہ پرسوں ٹامسن صاحب نے مجھے یاد فرمایا۔ کل میں پہونچا۔ صاحب کو اطلاع کرائی۔ خود پالکی سے اُتر کر ٹھہرا رہا کہ صاحب حسب دستور استقبال کو نکلیں گے تھوڑی دیر میں صاحب کا جمعدار بہ تن سوال بن کر نکلا کہ آپ اندر کیوں نہیں آتے۔ میں نے کہا صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر اندر جاؤں؟ جمعدار پھرا، رہ گیا تو صاحب خود باہر نکل آئے اور بولے جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت رئیس کے تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اس وقت وہ نہیں ہے۔

آزردہ — ہئے ہئے۔ مرزا تم نے غضب کر دیا۔

غالب — ہاں میں نے اُن کو صاف جواب دیا کہ صاحب میں سرکاری نوکری کو ذریعۂ افزایش عزت جانتا ہوں۔ یہ نہیں کہ بزرگوں کی بخشی ہوئی عزت بھی کھو بیٹھوں۔ بس یہیں بات تمام ہو گئی۔ ٹامسن صاحب نے اپنے دروازے کا رخ کیا اور میں نے غالب علی شاہ کے تکیے کا۔

شیفتہ — سبحان اللہ مرزا صاحب! دنیا کچھ بھی کہے، اس میں شک نہیں کہ خودداری اور آزادہ روی کو آپ نے انتہا پر پہونچا دیا۔

غالب — کل شام ایک غزل ہو گئی تھی جس میں اتفاق سے یہی مضمون آ گیا۔ لیجئے یہ پرچہ ملاحظہ فرمایئے۔

آزردہ — کیوں صاحب! یہ پرچہ وہی کیوں ملاحظہ فرمائیں پڑھ کر سنایئے — محفل کو محروم نہ کیجئے۔

شیفتہ — ہاں صاحب، تو پھر ارشاد ہو!

غالب — (داد تحسین کے شور میں یہ غزل ختم کرتے ہیں)

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا — پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دُکھ کہ کسی کو نہ ملا — کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں کے پُرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

اس طرح مرزا غالب کی زندگی کے پندرہ سال اور گزر گئے اس عرصہ میں خود انھیں صاحب مانے ہوئے بزرگانِ ادب میں شمار ہونے لگے۔ ایک خاندانی صدمہ اس عرصہ میں اُنھیں پہونچا۔ زین العابدین خاں عارف جوان ہوئے، شاعر بنے اور مر گئے۔ اِن کا چھوٹا بچہ حسین علی خاں اب مرزا صاحب گھر میں رہتا تھا، اور مرزا صاحب اُسے اپنے بیٹے کے مانند عزیز رکھتے تھے۔ شعر و سخن، نغمہ و سرود محبت و دوستی کی یہ فضا آخر کار ۱۸۵۷ء میں ایک دم برہم ہوئی۔ پہلے مئی میں انگریز قتل ہوئے۔ لیکن پھر ستمبر میں انگریزوں کی فتح مند فوج دلّی میں داخل ہوئی اور دلّی کے مسلمانوں نے وہ مصیبتیں دیکھیں جن سے چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ ہو گئی۔

ستمبر ۱۸۵۷ء میں مرزا غالب اپنے مکان میں بیٹھے ہیں۔ حسین علی خاں بھی موجود ہیں۔

غالب — بیٹا! بیٹا حسین علی خاں! حکیم صاحب نہیں آئے؟ — بہرا پن تو جان کا روگ بن گیا!

حسین علی خاں — (آواز بلند کرکے) دادا حضرت! شہر میں بلوہ ہو رہا ہے۔

غالب — بلوہ؟ ..... ابھی تک۔

حسین علی خاں — (چیخ کر) آپ سُن نہیں رہے ہیں۔ ہماری گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں؟

غالب — ہاں کچھ شور سا سنائی تو دیتا ہے ..... ہائے دلّی، کیا تو اس طرح سسک سسک کر مرے گی؟ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جا (پھر ذرا دھیمی آواز میں) اودھ کی سلطنت مجھ پر مہربان ہوئی۔ میری قضا نے اُسے دو برس میں ختم کر دیا۔ دلّی کی سلطنت کچھ زیادہ سخت جان تھی۔ سات برس تک مجھ کو روٹی دیکر بگڑی .....

حسین علی خاں — (پھر چلا کر) سنئے۔ بادشاہ سلامت کو گوروں نے پکڑ لیا!

غالب — (اسی لہجے میں) اچھا یہ شمع بھی بجھ گئی!

حسین علی خاں — (چیخ کر) اور سنئے، میر مہدی اور مولانا صہبائی قتل ہو گئے۔

غالب — (سرد آہ بھر کر) اللہ! — اللہ! (ہجوم کا شور گولی چلنے کی آواز)

حسین علی خاں — کلو کہتا ہے مولانا فضل حق کو گورے پکڑ کر لے گئے!

غالب — (بے تابانہ) ہائے!

حسین علی خاں — اور نواب مصطفےٰ خاں اور مفتی صاحب کو بھی!

غالب — اچھا ہے، اچھا ہے! میں بھی اب کفن پہن کر زندگی کے دن گزار دوں گا۔ جاؤ کلو سے کہو، میرے کپڑے لائے، میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں وہ حوالات میں میرے منتظر ہیں۔ (ہجوم کی چیخ پکار)

حسین علی خاں — (کانپتی ہوئی آواز میں) سرس کی گلی سے آدمی آیا ہے ..... دادا یوسف بیگ خاں کو گوروں نے مار ڈالا۔

غالب — مر گیا! یوسف مر گیا! اُف! اُف! میرا بھائی ..... (قہقہہ لگا کر) دیوانے کو گولی مار دی! اُف ... (کانپتی ہوئی آواز میں، بیٹا لوگ یوسف کو مجنوں کہتے تھے۔ آج میں مجنونوں سے بدتر ہوں — **حسین علیخاں** — دادا حضرت خدا کے ..... (حسین علی خاں کی آواز گولیوں کی باڑھ میں گم ہو جاتی ہے)

حسین علیخاں — دادا حضرت! حکیم صاحب تشریف لا رہے ہیں! — **غالب** — اب کیا فایدہ! — میرے سننے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے۔

(الحمرا) (پروفیسر) حمید احمد خاں

عہدِ حاضر میں حجری دور کا انسان

آسٹریلیا کی شمالی اطراف کی آبادی اب بھی "حجری دور" سے گزر رہی ہے۔ یہ آج بھی پتھر گھس کر اپنے اوزار بناتے ہیں اور دو لکڑیاں آپس میں رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں۔ مکانوں کی تعمیر میں یہ پرندوں سے زیادہ نہیں ہیں اور بارش سے بچنے کے لئے درختوں کی چھال، گھاس، اور جنگلی لکڑیوں سے کسی نہ کسی طرح اپنے گھونسلے طیار کر لیتے ہیں۔ یہ آج بھی قدیم طرز کے شکار اور جنگلی پھل پھول پر اوقات بسر کرتے ہیں۔ اس ملک میں کوئلہ، تانبا، چاندی، ٹین، لوہا، سب کچھ ہے لیکن ان کے لئے بالکل بیکار ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یونہی یہ لوگ سونے کو روند کر چلتے ہیں لیکن ان کی غربت کی کوئی حد و انتہا نہیں ـــــ انھوں نے زمین کو کبھی جوتنے بونے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ ان میں کبھی خوردنی اشیا پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جو کچھ بھی اچانک ہاتھ لگ گیا یا قسمت سے سامنے آگیا اسی پر زندگی بسر کرتے رہے اور آج بھی وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ المختصر انسان کی شکل و صورت اور جسم و حرکت رکھتے ہوئے بھی یہ لوگ آج تک جانوروں ہی کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں

اس ملک کے باشندوں یا ان کی فطرت سمجھنے کے لئے ان جانوروں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جن کے ساتھ یہ ہزاروں صدی سے رہتے چلے آئے ہیں۔ جو جانور آج کے مہذب ملکوں میں ہزاروں صدی قبل پائے جاتے تھے وہ آسٹریلیا میں آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے عجائب گھروں میں ازمنۂ قدیمہ کے جن جانوروں کے صرف ڈھانچے ملتے ہیں وہ آسٹریلیا میں آج بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں

اس ملک کے جانوروں میں سب سے پہلے کنگارو سامنے آتا ہے اس کے اگلے پاؤں بہت چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن پچھلے پاؤں نہایت مضبوط ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ جانور خطرناک نہیں لیکن چھیڑنے یا پیچھا کرنے پر اپنی حفاظت کے لئے اڑ جاتا ہے اور انسان کی جان تک لے لیتا ہے

زہریلے سانپ اور مکڑوں کے علاوہ اس ملک میں ایک قسم کی زہریلی چیونٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ سفید رنگ کی ہوتی ہیں اور زمین کے نیچے رہتی ہیں۔ ان کا دل باہر نکلتا ہے اور جو بھی لکڑی سامنے پڑ جاتی ہے اسے چبا ڈالتا ہے۔ ایک اور قسم کی چیونٹیاں ہوتی ہیں جو حملہ بھی کرتی ہیں۔ لیکن آسٹریلیا کے قدیم باشندے سب سے زیادہ اپنے یہاں کوؤں کو مارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کوئی بھیڑ بچہ دیتی ہے یا گرمی سے پریشان ہو کر تھک جاتی ہے تو کوّے اس کا گوشت نوچنے کے لئے اس پر حملہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھیڑ کی آنکھ تک نوچ کر لے جاتے ہیں اور اس جانور کو گھل گھل کر مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص جنگل میں راستہ بھول کر پیاس سے بیتاب ہو کر گر پڑتا ہے تو کوّے اس کی آنکھ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ اسی لئے یہاں کے باشندے کوؤں کو مارنے کے لئے دن دن بھر اس کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں

یہاں کے جنگلوں میں کچھ ایسے بھی پرندے رہتے ہیں جو انسان کے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں ان میں ایک "کوکابورا" ہے اس کی بولی ٹھیک انسان کی ہنسی جیسی ہوتی ہے۔ یہ سانپوں کے مارنے میں بڑا تیز ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندے اسے "مقدس" تصور کرتے ہیں۔ آسٹریلیا کے پرانے بسنے والوں کے خیالات اور معاشرتی زندگی پر انھیں جانوروں کا زیادہ اثر پڑا ہے

جب سے موجودہ دنیا کو آسٹریلیا کی دولت کا پتہ لگا ہے بہت سے یوروپین وہاں بس گئے ہیں اور ان کا اثر پرانے باشندوں پر پڑا ہے۔ لیکن بہت کم

"کارپینٹریا" کی خلیج کے جنوبی مغربی حصے میں قریب قریب ایک لاکھ سے زاید اب بھی قدیم باشندے پائے جاتے ہیں جو بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جہاں یہ قومیں سکونت پذیر ہیں وہاں سال کے زیادہ حصے میں پانی اور اشیائے خوردنی کی بڑی قلت رہتی ہے اور اسی وجہ سے آبادی

بڑھنے نہیں پاتی۔ بیس سے لیکر سو آدمیوں تک کی آبادی ایک جگہ پر رہتی ہے لیکن خاص خاص موقعوں پر اس آبادی میں وقتی اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

ان کی رسمیں بھی عجیب وغریب ہیں اور ان رسوم کو ادا کرتے وقت یہ لوگ اپنے ملک کے جانوروں اور پرندوں کی سی بولی بولتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کا جسم پورے انسان کا جسم نہیں تھا۔ اور ان کو پورا بنانے کا فخر جانوروں کے اندر رہنے والے فرشتوں کو حاصل ہے۔ کافی مقداریں غذا میسر نہ آنے کے باعث ان "مجری دور" میں رہنے والوں کے ہاں بعض عجیب رسمیں برتی جاتی ہیں۔ مثلاً قوم کا نمایندہ بننے کے لئے آزمایش کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر آزمایش نہایت خطرناک ہوتی ہے۔ بچے جب بڑوں کو مدد پہونچانے کے لایق ہوجاتے ہیں تو ان پر کھانے پینے کی چیزوں کی پابندیاں عاید کردی جاتی ہیں۔ انھیں ایک خاص قسم کی لذیذ چربی کھانے سے روک دیا جاتا ہے۔ جب اس قسم کی چربی دستیاب ہوتی ہے تو سب سے پہلے بوڑھوں کو دی جاتی ہے اور جو شخص اس قانون سے انحراف کرتا ہے اسے سخت سزا ملتی ہے۔ اور جادو کے اثر سے اندھے، لولے اور لنگڑے ہونے کا خوف بھی دلایا جاتا ہے۔ اسے یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ ممنوعہ حرکات کا مرتکب ہونے سے داڑھی جو بزرگی کی نشانی ہے، ظاہر نہ ہوگی۔ اس قسم کے سخت قوانین اور رسوم کا مقصد یہ ہے کہ بوڑھوں کو ذائقہ دار چیزیں ہمیشہ ملتی رہیں۔ جو شخص کسی خدمت سے علحدہ کیا جاتا ہے اسے معزول ہونے سے قبل طرح طرح کی اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے، ان عقوبتوں میں اس کا زندہ بھونا جانا بھی ہے۔ کندے کی آگ پر وہ پانچ منٹ تک چت لٹایا جاتا ہے آنچ دھیرے دھیرے تیز کردی جاتی ہے۔ پھر پانچ منٹ تک وہ پٹ لٹایا جاتا ہے۔ شخص مذکور کو برابر کروٹ بدلتے رہنا پڑتا ہے تاکہ اس کے جسم کا ہر حصہ جل سکے۔ اس آزمایش کے ختم ہونے کے بعد وہ شخص رسم ادا کرنے والے بوڑھوں سے پوشیدہ باتیں سیکھنے کا مستحق ہوجاتا ہے۔ بوڑھے اس موقع پر اپنے آپ کو قوم کے آباؤ اجداد کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسی لئے ان کے جسم پر خاص قسم کی نقاشی بھی ہوتی ہے۔ اپنے جسم پر سانپ کی تصویر بنانا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اسی کو یہ لوگ آدمی کو پیدا کرنے والی "مقدس مچھلی" سمجھتے ہیں

اس کے علاوہ زبان شگافی اور مُوتراشی کا رواج بھی ہے۔ قوم کے کسی شخص کی وفات پر گرم پتھر سے سینے کو داغنے کی رسم بھی پائی جاتی ہے۔ مرد اپنے بالوں کے بدلے عورتوں کے بال کاٹ کر اپنی باہنوں پر باندھتے پھرتے ہیں۔ دانت توڑوانے کا رواج اب مردوں سے اُٹھ گیا ہے لیکن عورتوں کے لئے لازم کردیا گیا ہے۔ چھڑی سے مار مار کر پہلے ان کے دانت ہلا دئے جاتے ہیں اور پھر پتھر کی مدد سے اُکھاڑ دئے جاتے ہیں۔ اس عمل کے بعد عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ بہت خوبصورت ہوگئی ہیں

طرح طرح کی عقوبتیں برداشت کرنے کے باعث یہاں کی عورتوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ پچیس سال کے اندر ہی ان میں پیری کے تمام آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ یہاں سے زیادہ اذیت برداشت کرنے والی عورتیں دنیا کے اور کسی ملک میں شاید ہی ملیں۔ کھانے کی تمام اچھی چیزوں سے عورتوں کو اجتناب کرنا پڑتا ہے، رسوم ادا کرتے وقت بھی کھانے پینے کی عمدہ چیزیں ان سے الگ کردی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مردوں کے ہاتھوں اور بھی طرح طرح کے ظلم ہوتے رہتے ہیں۔ کسی قبیلہ کے چار آدمی اگر تھوڑے عرصہ میں مرجاتے ہیں تو سب عورتوں کو ایک سال تک گونگا رہنا پڑتا ہے۔ وہ ایک لفظ نہیں بول سکتیں۔ سال کے آخر میں وہ مرد کا ہاتھ دانت سے کاٹتی ہیں اور اسے کھانا دیتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں اس قید سے نجات ملتی ہے۔ اگر کوئی عورت تکلیف برداشت کرنے کے ڈر سے بھاگنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس وقت وہ ایک خاص طرح کی آواز سنتی ہے جسے اس کی قوم کے تمام افراد "توانیکا دیو" کی آواز مانتے ہیں۔ اس آواز کا مفہوم وہ یہ سمجھتی ہے کہ دیوتا مذکور اس کو نہ بھاگنے کی تلقین کر رہا ہے۔ بڑی ہوجانے پر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوجاتی ہے کہ وہ آواز ایک کھوکھلی لکڑی سے نکلتی ہے تاہم سماج کے قانون کے مطابق وہ اس راز کو کسی پر افشا نہیں کرسکتی۔

کھانے کی چیزیں کثیر مقداریں نہ ملنے کے باعث جب انھیں کوئی بیماری ہوجاتی ہے تو وہ اسے سحر کا نتیجہ جانتی ہیں اور یقین رکھتی ہیں کہ یہ جادو دشمن نے زہریلی ہڈی کی شکل میں ان پر کیا ہے۔ علاج کے لئے مریض لیٹ جاتا ہے اور جادو جھاڑنے والے کچھ دیر اسے غور سے دیکھتے ہیں اس کے بعد مریض کے جسم پر لیٹ کر اس کی مالش کرتے ہیں اور دانت سے کاٹ کاٹ کر زہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فطری موت پر بھی ان کو یقین نہیں ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں وہ عجیب وغریب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ جس وقت کوئی شخص نزع کی حالت میں ہوتا ہے اسی وقت سے ماتم شروع ہوجاتا ہے۔ لوگ روتے چلاتے اور بے ہوش ہونے لگتے ہیں۔ عورتیں اپنی ران کو زخمی کردیتی ہیں اور کبھی کبھی یہ

زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں۔ ایک شخص کے مرتے ہی عورت مرد سب چھڑی لاٹھی ہاتھ میں لیکر ایک دوسرے کو مارتے ہوئے جلوس بنا کر نکلتے ہیں۔ اس موقع پر ایک دوسرے کے حملے سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لئے لوگوں کا جسم لہولہان ہو جاتا ہے۔ تین روز کے بعد لوگ کسی کھوہ کے پاس جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کسی جانور یا پرندے کا نقش قدم ہے یا نہیں۔ اگر کوئی نشان انھیں مل جاتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اُس دشمن کا پتہ لگا لیتے ہیں جس کے سحر سے اس کا انتقال ہوا ہے اور اس سے وہ انتقام لیتے ہیں۔ اگر درخت کی کھوہ میں انھیں کوئی نشان نہیں ملتا تو وہ لاش کو ایک سال تک وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ سال کے ختم ہونے پر لاش کی ہڈیاں نکالی جاتی ہیں۔ اس موقع پر سب سے کم عمر نوجوان پتھر کے کلہاڑے سے اس کے ڈھانچہ کو توڑتا ہے اور ہاتھ کی ایک ہڈی کو چھوڑ کر باقی تمام ہڈیوں کو درخت کی چھال میں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

آسٹریلیا میں کچھ قومیں ایسی بھی ہیں جو مُردوں کا گوشت کھانا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ سمجھتی ہیں کہ مرنے والا پھر انھیں کی قوم میں جنم لے گا کچھ قومیں ایسی ہیں جو درخت کے کھوہ سے ہڈی نکال کر اسے سفید جیونٹیوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ صرف ہاتھ کی ہڈی پاس رکھ لی جاتی ہے۔ قوم کا سردار اس ہڈی کو کھال میں لپیٹ کر کسی درخت کے کھوہ میں رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد لوگ شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور شکار کا گوشت پتے میں لپیٹ کر مرحوم کے ہاتھ کی ہڈی کے ساتھ جو الگ لپیٹی جاتی ہے۔ مرحوم کے باپ کو دیدی جاتی ہے۔ اس موقع پر تمام عورتیں جمع ہو کر روتی چلاتی ہیں۔ مرنے والے کا باپ سب سے زیادہ معمر عورت کو ہڈی رکھنے کو دیتا ہے۔ باقی عورتیں کھانے کے لئے سانپ پکانے لگتی ہیں۔ اور مرنے والے کا بھائی بوڑھی عورت سے ہڈی لے کر کسی گڑھے میں دفن کر دیتا ہے۔

یہ لوگ ان رسوم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ رسوم ہی ان کی دلبستگی کے بہترین سامان ہیں اگر ان کو اُٹھا دیا جائے تو ان کی زندگی نے لطف ہو جائے

عورتیں کھانے کے لئے سانپ، چھپکلیاں، یا گھاس کے بیج جمع کرتی رہتی ہیں۔ سارا کام یہاں عورتوں کو کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کو فراغت ہی رہتی ہے۔ انھیں جب اور کوئی رسم ورواج ادا نہ کرنا ہوا تو کسی خاص جگہ پر اکٹھے ہو کر پرندوں کے پر سے اپنے آپ کو سجاتے اور رقص کرتے ہیں اس رقص کو وہ "کوروبوری" کہتے ہیں۔ اس جشن میں وہ بچوں اور عورتوں کو شریک نہیں کرتے۔

نظیر صدیقی

کیا اس کتاب کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں — اگر نہیں۔ تو پہلی فرصت میں اسے طلب فرمائیے :-

"۵۵ سال کے بعد"

یہ کتاب نفسیاتِ عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو بار بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

۱- دنیا کا ہر رنج والم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا۔

۲- آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا۔ قیمت عہ/۱۲ منیجر نگار

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

ناواقف لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اسکو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گہوارہ سے لیکر لحد تک عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قایم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو، اور اس التزام کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ادب لکاتب و الشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

ادنیٰ تغیر کے ساتھ

جس طرح گانے میں آواز اور جسمانی حسن میں اعضا کا تناسب ضروری ہے اسی طرح شعر و ادب میں تناسب الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے گو اس کا تعلق زیادہ تر ذوق و وجدان سے ہے اور اس کا کوئی عام اُصول مقرر نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر ہم الفاظ یا تراکیب کے حسن و قبح کو پہچان سکیں، تاہم اہلِ فن نے کچھ اصول منضبط کر دئے ہیں مثلاً:۔

(۱) کلام کو تنافر سے پاک ہونا چاہئے۔ اس سے مراد ایسے حروف کا اجتماع ہے جو قریب المخرج ہیں جیسے یہ جملہ حیدر آباد میں مشہور ہے:۔
(کیا بٹ لی پتلی بتی) چونکہ اس جملہ میں ب، پ، ٹ اور ت سب قریب المخرج ہیں اس لئے ان کا اجتماع مناسب نہیں

(۲) دو لفظوں کی ترکیب سے اگر کوئی ایسا ناگردہ معنی پیدا کرنے والا لفظ بن سکتا ہو یا جس میں ذم کا پہلو نکلے۔ تو اہلِ لکھنؤ نے اسے قابلِ ترک قرار دیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب کا مصرع ہے:

منہ تمہارا ہے اور میری نظر دونوں ساتھ ـــــ یا ـــــ منہ تو دیکھو آئینہ کا یہ صفائی لا سکے

پہلے مصرعہ میں "موت مارا" اور دوسرے میں "موتو اور دیکھو" کا تلفظ ہوتا ہے یا مثلاً ایک مصرع ہے:۔
"سب ترے ناز ہیں گو زندہ ہی کرنے والے" ـــــ اس مصرع کا لکھنؤ میں یہ نتیجہ ہوا کہ جناب مرزا اوج نے کلیہ بنا لیا کہ گو کے بعد ایسا لفظ ہی نہ آنے پائے جس کی ابتدا ز سے ہو۔

شیخ ناسخ کے شاگرد سید علی حسن اشک مرحوم منصب داروں میں تھے اور صاحب دیوان تھے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں ان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا:۔ "دست و پا دیں گے گواہی مری روزِ محشر" ـــــ لوگوں نے مصرع بار بار پڑھوایا اور آجتک باندے کا ذکر چلا جاتا ہے۔
قدیم زمانہ کا ذکر ہے کہ ملول تازہ وارد، لکھنؤ کے مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ مقطع یہ تھا:۔

یہ آرزو ہے کہ شمشیر ناز سے گردن ـــــ کوئی ملول کی اُس رہ گزار پر مارے

سامعین کو تاب ضبط نہ رہی ہر شخص کہتا تھا دوسرا مصرعہ پھر فرمایئے۔ دوسرے مصرعہ سے حد درجہ قبیح معنی پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) الفاظ مضحک و رکیک کے علاوہ یوں بھی کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے مقصود کے علاوہ کچھ اور معنی پیدا ہو سکتے ہوں بُرا ہے، کیونکہ اس سے سننے والے کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں نے ایک مطلع کہا:۔

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف ـــــ کہ مجھ کو چھوڑ کے بسمل چلا ہرن کی طرف

ساتھ ہی خیال ہوا کہ اس کو یوں بھی لکھ سکتے اور پڑھ سکتے ہیں:۔ "چلا ہے رن کی طرف"۔ اس لئے یہ مصرع بدل کر یوں کر دیا:۔
"چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے ہرن کی طرف"۔ ایک مرثیہ کا مصرع ہے:۔ "تمام شہر ہے شایق علی کے پیاروں کا"۔

اس میں دھوکا ہوتا ہے کہ شاید شایق علی کسی خاص شخص کا نام ہے۔ میر مونس مرحوم کی غزل کا مطلع ہے:۔

کیا خبر لائی صبا موسم گل لانے کی بوتلیں سرخ ہیں ساقی ترے میخانے کی

پڑھنے میں گل کا لام دوسرے لام سے مل جاتا ہے اور بُرا معلوم ہوتا ہے یا یہ مصرع:۔ "چمن میں گل، گلوں میں بو ہے جب تک"۔۔۔۔ پڑھنے میں گلگلوں ہو جاتا ہے۔

شیخ ناسخ نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانہ میں جو وصیت کی تھی اس میں اس امر کی بھی ہدایت کی تھی کہ کسی لفظ کے آخر سے الف، واؤ، ی کا بے تکلف گرا دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا اور برجستگی کلام کے منافی ہے۔ لیکن شیخ کی اس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا۔ شیخ کا متنبہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا گیا کہ میکنی و میروی میں سے ی کو گرا دیں یا گفتگو و شست و شو میں سے واؤ اور دریا و گویا میں الف ساقط ہونے دیں۔ ہاں الف مقصورہ کو وہ لوگ کبھی الف سمجھتے ہیں کبھی ی اور محمد تقی خاں سپہر نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ الف مقصورہ کو ی کی طرح بھی نظم کر سکتے ہیں۔ آزاد مرحوم آبِ حیات میں خواجہ آتش پر حلوۂ بے دود کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ اعتراض ان کا غلط ہے۔ حلوہ میں ہ نہیں ہے الف مقصورہ ہے، اور حلوائے بے دود اور حلوئی بے دود دونوں طرح لکھنا صحیح ہے۔ ہائے مختفی کو فارسی والے کبھی گراتے ہیں اور کبھی نہیں گراتے مگر غالب مرحوم، مژہ کی ہ کا گرانا لازم سمجھتے ہیں مثلاً:۔ "دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہ ہو"۔ مجھے یہ نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ فردوسی کا مصرع ہے:۔ "مژہ تیرگی بُردہ از تیرِ زاغ"۔ اس میں مژہ کی بندش اچھی معلوم ہوتی ہے۔

جلال مرحوم نے ایک دفعہ اپنی کچھ غزلیں مجھے سنائیں یہ کہہ کر کہ اس میں کوئی حرف دبنے نہیں پایا ہے۔ میں نے ان غزلوں کو سنکر کہا کہ شیخ کا مقصود یہ نہیں ہے کہ میں، سے، کو، کے میں بھی ی اور واؤ نہ گرے، فارسی والے بھی دو اور تو اور چو کا واؤ گراتے ہیں۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ جن حروف کا گرنا جن الفاظ میں گراں معلوم ہو انھیں نہ گرانا چاہئے، کہنے لگے میں نے تو التزام کیا کہ کوئی حرف نہ گرے اور اس میں زیادہ بندش کی صفائی معلوم ہوتی ہے، میں نے کہا جب نہیں اور ہیں اور میں کا نون آپ نہ بچا سکے تو التزام کہاں رہا، اس پر وہ ہنسنے لگے۔

فارسی والے آخر کلمہ سے الف نہیں گراتے لیکن ابتدائی کلمہ کے الف کو بے تکلف گرا دیتے ہیں، اُردو میں بھی باتفاق اسے جایز سمجھتے ہیں مگر بعض جگہ سلاست کلام کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مصرع ہے:۔

لکھوں شرح اس کی تو ہو جائے کتاب عبرت ۔۔۔ یا جیسے ۔۔۔ ہوئے ہیں حاکمِ شرع آج ساقیِ کوثر

پہلے مصرعہ میں "شرح اس کی" "شراس کی" ہو گیا اور دوسرے مصرعہ میں "شرع آج" "شرآج" پڑھا جاتا ہے۔

اُردو میں عربی، فارسی کے جو الفاظ پائے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں:۔

ایک وہ جن میں اہلِ ہند نے لفظی و معنوی کوئی تغیر نہیں کیا جیسے الم و رقم وغیرہ ایسے الفاظ بے تامل استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

دوسرے، وہ الفاظ جن میں لفظی تغیر ہو گیا ہے جیسے عَلَف کو عَلَف اور حَرَف کو حَرَف بول یا دیوانہ کو دوانہ، بیعانہ کو بیانہ، المضاف کو المضاف، لیمو کو نیبو کہہ دیا کرتے ہیں یا جیسے موسم و موکب و موقف و موضع و موقع و مولد و مورد وغیرہ اور سیّد و جیّد و میّت و میّر وغیرہ میں حرف آخر کے ماقبل فتحہ دیا کرتے ہیں حالانکہ صحیح یہ ہے کہ کسرہ پڑھیں یا جیسے حیض بیض کو ایک صاحب اسے ایس بیس سمجھے اور لیس کے ساتھ اُسے قافیہ کر دیا۔ اس قسم کے الفاظ کا صحیح استعمال لازم ہے۔ اسی طرح خون و جنون و زمین و آسمان وغیرہ بہ اعلان نون ہندی الفاظ ہیں، اس لئے ایسے الفاظ کی ترکیب فارسی میں لاکر اعلان نون کا باقی رکھنا غلطی ہے۔ کیونکہ اہلِ فارس کی زبان میں اعلان نون نہیں ہے اس غلطی سے بھی شعرا احتراز کرتے ہیں تاکہ ترکیب میں ہندی و فارسی الفاظ کا غلط ملط نہ ہو جائے، لیکن تمع۔ سوا اور بعض یہ تین لفظ اس قدر زبان پر چڑھے ہوتے ہیں کہ ان الفاظ کو بے تکلف ہندی لفظوں کی طرف مضاف کر دیتے ہیں اور یہ آفت معتبر لوگوں کے کلام میں بھی موجود ہے مثلاً:

"سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے"۔ تمع تین رقوم جواہر۔ بعض لوگ وغیرہ۔ یہ عامیانہ محاورہ ہے اور لطف یہ ہے کہ مضاف الیہ میں

کبھی کبھی کے بھی لگا دیتے ہیں مثلاً "سوائے تم لوگوں کے میرا کون ہے"۔ "مچھر کے بالوں کے روانہ ہوا"۔ اسی طرح لفظ بعض اشخاص میں کسرۂ اضافی سے غفلت کرتے ہیں مگر جو لوگ لکھے پڑھے ہیں وہ اس سے احتراز کرتے ہیں۔

تیسرے وہ الفاظ عربی و فارسی کے ہیں جن میں معنوی تغیر ہو گیا ہے، یعنی اہلِ زبان اس لفظ کو کسی اور معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اہلِ ہند کسی اور معنی میں مثلاً محرم کا لفظ اردو میں (دھگیا) چھوٹے کپڑوں کے معنی میں مستعمل ہے اور عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس سے پردہ نہ کیا جائے یا تردد کا لفظ عربی میں امد و رفت کے معنی میں ہے اور اردو میں فکر و تشویش کے معنی میں بولتے ہیں یا جیسے لفظ نم کہ فارسی میں تری کے معنی میں ہے اور اردو میں تر کے معنی میں بولتے ہیں یا جیسے لفظ خفت اردو میں شرمندگی کے معنوں پر مستعمل ہے۔ اس قسم کے الفاظ کا تفحص کرنا چاہئے اور ان کو ہندی سمجھنا چاہئے۔ انھیں فارسی۔ عربی کا لفظ سمجھ کر ترکیب اضافی سے بچنا چاہئے۔ یعنی جس طرح کپڑۂ رنگین کہنا صحیح نہیں۔ اسی طرح محرم رنگین اور چشم نم کہنا بھی ناجایز ہے کیونکہ کسرۂ اضافی یا توصیفی فارسی الفاظ کے لئے مخصوص ہے اس قسم کی غلطیوں سے بچنا بہت مشکل امر ہے میں نے مرزا بیدل کے کلام میں دیکھا ہے۔ "فارغ از جوش غبار است زمینے کہ نم است"۔ اور فیضی سا شخص بھی دھوکا کھا گیا، اگر کوئی کہے کہ بیدل و فیضی جو کچھ کہ جائیں وہ غلط نہیں ہو سکتا، تو اہلِ فن اس کو نہیں مانیں گے۔ اہلِ زبان کبھی چشم نم نہیں کہتے جب کہیں گے نم چشم کہیں گے ان تینوں قسموں کے علاوہ ایسے لفظ بھی اردو میں بہت سے بولے جاتے ہیں کہ ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے ان کا اشتقاق کر لیا ہے اور اہلِ زبان اس اشتقاق سے بے خبر ہیں مثلاً تمونہ تو فارسی لفظ ہے اس سے ہندیوں نے تمانت مصدر عربی بنا لیا۔ اسی طرح علالت، بخالت، ذہانت، لیاقت، شمولت، ملت، یگانگت وغیرہ ہندیوں نے قیاس سے مصدر بنائے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال اکثر تو ناجایز ہے لیکن اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے جیسے بادشاہت وغیرہ تو اسے ہندی لفظ سمجھنا چاہئے کسرۂ اضافی یا توصیفی یا کسی اور ترکیب عربی و فارسی کے ساتھ اس کو استعمال کرنا درست نہیں مثلاً جس طرح پیار و چاہت بعطف فارسی کہنا جایز نہیں اسی طرح امارت و بادشاہت کہنا بھی نادرست ہے۔

بعض الفاظ میں یائے مصدری زیادہ کی جاتی ہے حالانکہ وہ سب الفاظ خود معنی مصدری رکھتے ہیں یہ بھی ہندیوں کا تصرف ہے جیسے انتظامی، تغافلی، طغیانی، غلطی، صفائی، ادائی، اجرائی وغیرہ۔ بعض الفاظ میں علامت جمع زیادہ کر دیتے ہیں حالانکہ وہ سب الفاظ خود جمع ہیں جیسے اغیاروں، کفاروں، ارواحوں، آثاروں، اعمالوں۔ یا یہ کہ فارسی یا ہندی الفاظ میں علامت جمع عربی کی لگا دی جیسے جاگیرات، دیہات، باغات، جہازات، بہتات وغیرہ اسی طرح لوازمات و احکامات کو بھی سمجھ لیجئے۔ یا اسی طرح اسم صفت بہت سے ہیں جو ہندیوں نے تراشے ہیں۔ جیسے حرفتی، صنعتی، پیشگی، گھمنڈی، جوشیلا، شوقین، سمجھدار، وضعدار، طرحدار، تابعدار وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ کا تفحص کرنا اہلِ قلم کو ضرور ہے ورنہ خطا سے نہیں بچ سکتے۔ ابوالفضل سا علامہ اور لکھے۔ "از حمر احتیالی روزگار کم فطرت"۔ یہاں میں نے یہ تاویل کر لی کہ احتیالی میں یائے مصدری کاتب نے بڑھا دی ہوگی۔ لیکن "مسہرۃ الصدر و مغفرۃ القدر" میں کیا تاویل ہو سکتی ہے یا عند الخواہش و علمک ناقصک و محبت ناقصک، و مخدوم الانامی و اعتضاد الکرامی و مخلصان اعتضادی و مخلصان استظہاری و قبلہ گاہی وغیرہ میں شوخی قلم کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں تعجب ہے کہ قدرتی، فطرتی، عادتی کہنا تو غلط یا ہندی سمجھا جائے اور کم قدرتی و بلند فطرتی و خوش عادتی فارسی صحیح ہو جائے۔ مثلاً:۔

آہم بروئے آئینۂ مہ کلف شود — ایں گرم المفتی تو تا بر طرف شود

بعض الفاظ اردو میں ایسے زبان زد ہیں کہ ان کا کچھ پتہ نہیں لگتا کہ کس زبان کے ہیں اور اصل ان کی کیا ہے۔ جیسے الغاروں، زرغل، الماغوچی، لقات، مرزتی، مزمہ وغیرہ یہ سب الفاظ عامیانہ سمجھے جاتے ہیں اور اہلِ ادب ان سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

اکثر الفاظ انگریزی کے اردو میں ملتے چلے جاتے ہیں اہلِ ادب ان کے استعمال سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ بلکہ عربی و فارسی کے سوا جن جن زبانوں کے الفاظ اردو میں ملکر اصل سے متجاوز ہو گئے ہیں ان کا صحیح کر کے استعمال کرنا ہرگز درست نہیں سمجھتے مثلاً بوتل، نمبر، لالٹین، بسکٹ وغیرہ کو اب ہندی ہی سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح سنسکرت اور بھاکا کے بہت سے الفاظ اردو میں آکر بدل گئے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو خاص طبقہ والوں کی اصطلاح ہیں مثلاً کبوتر بازوں نے گھاگھ کا لفظ یا لخلخانا کبوتر کے لئے وضع کیا ہے، اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص بڑے گھاگھ ہیں یا یہ

بچہ پیاس سے نڈھال رہا ہے تو اسے سمجھنا چاہیے کہ اس شخص یا بچہ کو کبوتر قرار دیکر ایسا کہا گیا ہے، اسی طرح ایک مثال یہ ہے: "فلاں عورت کو ٹاکڑا ہی ہے" گویا اسے مرغی سمجھ کر ایسا کہا یا "میری ان کی دو دو چونچیں ہوگئیں"۔ مرغبازوں کی زبان ہے اسی طرح شیخی بگھارنا۔ جھاڑ و پھیر دینا باورچنوں کی اصطلاح ہے۔ کہتے ہیں "اس کو تو گوڑی مل گئی" یہ کسانوں کی اصطلاح ہے یا رتی چڑھ گئی جوہریوں کا محاورہ ہے۔ اسی طرح گاڑھی چھننا اور چکا چھوٹنا بھنگ پینے والے اور جواری بولتے ہیں یا مثلاً شے دینا اور پیچ پڑ جانا اور پیٹا توڑنا کنکوے کے مصطلحات سے ہے، نوج (نعوذ باللہ کی بگڑی ہوئی صورت) وغیرہ عورتوں کی زبان ہے یہ سب محاورات ایسے ہیں کہ اہل زبان بھی جب تک ان کی اصل سے واقف نہ ہوں محل استعمال میں غلطی کرتے ہیں۔

ہر زبان میں بعض الفاظ محل مدح کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور بعض انھیں کے ہم معنی مقام ذم میں مستعمل ہیں مثلاً توانا اور ٹانٹھا اور مسٹنڈا اور دبنگا یا چھریرا اور لقات، اسی لئے آسماں شکوہ و سپہر مرتبت کہنا صحیح ہے اور چرخ شکوہ یا چرخ مرتبت کہنا غلط۔ اس کے علاوہ اہل قلم کو اس بات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض الفاظ کا استعمال کہیں حسن پیدا کرتا ہے اور کہیں وہ حسن پیدا نہیں ہوتا۔ ادیب وہی ہے جو ہر لفظ کے محل استعمال کو اچھی طرح جانتا ہو اور ہر ہر مقام میں جو نازک فرق ہے اسے پہچانتا ہو۔ مرزا دبیر کی زبان کہیں محاورۂ لکھنؤ سے الگ تھوڑی ہے بلکہ ہر لفظ اور ہر محاورہ ان کا اُردو کے لئے سند ہے لیکن میر انیس کی زبان اور ہی کچھ ہے۔

اُردو کے بعض الفاظ لکھنؤ کے اکثر غزل گویوں نے ترک کر دئے ہیں، ان لوگوں میں رشک و تجرو اسیر و اُنس ہیں اور متبعین میں عشق و جلال و امیر و منیر و قدر بلگرامی ہیں۔ متروکات میں کہیں تو تخفیف لفظ کو انھوں نے منشاء ترک قرار دیا ہے مثلاً تک میں بہ نسبت تلک کے تخفیف ہے اور دکھلانا، بتلانا اور بٹھلانا کے مقابلہ میں دکھانے، بتانے، بٹھانے میں اختصار ہے۔ ہووے کے بدلے ہو کہنا بہتر ہے۔ ہیگا میں گا، ادھر کو اور اُدھر کو میں کو بیکار ہے۔ کہیں انھوں نے قیاس نحوی کو بھی دخل دیدیا ہے، مثلاً آنکر کہنا غلط سمجھتے ہیں آکر چاہئے سمجھوں سے غلط ہے سب سے کہنا چاہئے۔

کہیں خلاف فصاحت ہونے کو سبب قرار دیا مثلاً مرا، ترا قابل ترک ہے میرا، تیرا کہنا چاہئے۔ لیجے، دیجے، کیجے کی جگہ لیجئے، دیجئے، کیجئے کہنا اچھا ہے، گر کے بدلے اگر اور سدا کے مقام پر ہمیشہ اور پر، اوپر کی جگہ لیکن، مگر کی جگہ یاں، واں کے محل پر یہاں، وہاں، تہیں کی جگہ کو کہنا چاہئے۔ ان سب باتوں پر انیس و دبیر و مونس و انس و وحید و نفیس وغیرہ اور بعض غزل گویوں نے بھی اعتنا نہیں کی، ان کے شاگردوں میں البتہ اس کی پابندی رہی اور بعض شعرائے دہلی مثلاً مرزا داغ وغیرہ کے دھوکے میں آکر ان باتوں کے پابند ہو گئے، ان متروکات میں جہاں جہاں تخفیف لفظ و قیاس نحوی کو انھوں نے منشاء ترک ٹھہرایا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ رہا یہ کہ جن الفاظ میں انھوں نے خلاف فصاحت ہونے کو سبب ترک خیال کیا ہے اس پر عمل کرنا البتہ بہتر ہے۔ ہاں ایسے الفاظ کا استعمال جو زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں کسی قدر غیر فصیح ہونے کے باوجود برا نہیں تو کو اگر جرأت نے ترک کر دیا ہوتا تو یہ شعر کا ہیکو سننے میں آتا:

گو دل سے زباں تک ہیں ہزاروں ہی گلے، پر کچھ منہ سے نکلتا ہی نہیں وقت ملے پر

البتہ نثر میں اس کی پابندی نہ کرنا ستم ہے۔ اسی طرح تئیں کو بالکل چھوڑ دینا بھی مشکل ہے۔ ایک شخص سے کسی نے کہا کہ تئیں کا لفظ نہ بولا کیجئے انھوں نے جواب دیا کہ اگر مجھے یہ کہنا منظور ہو کہ "اپنے تئیں میں بیوقوف سمجھتا ہوں" تو کیا اس کے بدلے میں یہ کہوں کہ "آپ کو میں بیوقوف سمجھتا ہوں"

(نوٹ) اس مضمون کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہے گا۔ اس کی دوسری قسط آئندہ ماہِ دسمبر میں شایع ہوگی اور باقی قسطوں کا سلسلہ سالنامہ کی اشاعت کے بعد مارچ ۵۲ء سے پھر شروع ہوگا

(اڈیٹر)

بابِ لاستفسار

مذاہبِ عالم اور خدا کا تصور

(ام - امام، موتیہاری)

مکرمی - سلام مسنون !

مجھے مذاہبِ عالم کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہے اور اس کے لئے سارے ہندو پاکستان میں اگر کسی پر نظر پڑتی ہے تو وہ آپ ہیں اور مجھے امید ہے کہ علم کے اس سمندر میں جہاں چڑھتی ہوئی موجیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں وہاں اترتی ہوئی لہریں ایک پیاسے کو اس کی پیاس بجھانے کا بھی موقع عنایت کریں گی !

تاریخ کے لحاظ سے مذاہبِ عالم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جو اپنی دوکان بڑھا چکے ہیں اور دوسرے وہ جو اب بھی کشت و خون کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں - جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے میرے خیال میں آریہ، مصری اور یونانی قومیں ثقافتی اعتبار سے آج بھی اپنی انفرادیت کا دعویٰ کر سکتی ہیں مگر کیا مذہبی طور پر بھی ایسا ممکن ہے ؟ — میرا مطلب ہے کیا ان میں خدا اور اس کی پرستش کے لحاظ سے بھی یگانگت پائی جاتی ہے ؟ — اگر ہاں تو کسی اور نہیں تو کیا بُعد ہے ؟

آریہ قوم سے میری مراد ان دراوڑوں (Dravidians) سے ہے جن کی تہذیب ایشیا میں اگر ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی سرزمین سے سر اُٹھا رہی ہے تو یوروپ میں مسوپوٹامیہ کے ٹیلوں سے (جیسا کہ خیال ہے) اسی طرح مصری تمدن سے فراعنہ مصر کا تمدن مراد ہے اور یونانی ثقافت سے وہ ثقافتی دور جب ڈیانا (Diana) کے مندر بنانے کے جذبے نے وہاں والوں میں کروٹ لی تھی !

اب رہے موجودہ دور کے مذاہب تو ان کی رو سے ساری دُنیا کی آبادی مندرجۂ ذیل قوموں پر مشتمل ہے :

۱ قدیم باشندے (Aborigines)
۱ - گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے اسکیمو
۲ - امریکہ کے سرخ ہندی
۳ - آسٹریلیا کے قدیم باشندے
۴ - افریقہ " " "
۵ - ایشیا " " "
۶ - یورپ " " "

۲ اسرائیلی (یہودی)

۳ زرتشت

۴ اہلِ ہنود

۵ جین

۶ بودھ

۷ نصرانی

۸ مسلمان

۹ سکھ

۱۰ بالشوکس

کیا میں کسی اور مذہب کا نام گنوانا تو نہیں بھول گیا ؟ — اور اگر بھول گیا ہوں تو کیا آپ میری رہنمائی کی تکلیف گوارا فرمائیں گے ؟ - اب ان مذاہب کے متعلق جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ان میں انفرادی طور پر خدا کا تخیل (Conception) کیا ہے اسکی پرستش (یا خوشنودی) کے کیا طریقے ہیں اور قدامت کے لحاظ سے ان کی تنظیم ہوگی ؟

کیا یہ سوالات آپ کے قیمتی وقت کے شایان شان ہیں ؟ — پیاسے کو شبنم ہی ملے گی ؟ — اگر کچھ کتابیں ایسی ہوں جن سے ان مضامین پر سیر حاصل معلومات بہم پہونچ سکیں تو میں شاید اپنی مدد آپ کر سکوں مگر قیمتی کتابوں کا کفیل مجھ جیسا طالبعلم شاید نہ ہو سکے ! پھر بھی اگر گراں خاطر نہ ہو اور آپ ان کے نام ارسال فرما دیں تو میں کتب خانوں کی خاک بھی چھان لوں !

اب سب کی طرح میں بھی جواب جلد ارسال فرمانے کی گزارش کیسے کروں جب یہی پتہ نہیں کہ آیا یہ خط آپ کے لئے جواب کے قابل بھی ہے!

(نگار) آپ کے سوال کے دو حصے ہیں ایک تو یہ کہ پرانے زمانہ کی قوموں میں خدا کا تصور اور اُس کی پرستش کے طریقے کیا تھے اور دوسرا یہ کہ موجودہ اقوام میں اب اس کے کیا معنی ہیں۔

پرانے زمانہ میں وادی سندھ (ہڑپا اور مہنجو دارو وغیرہ) میسوپوٹامیا۔ مصر اور کریٹ میں قریب قریب یکساں تمدن پایا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ "شیو اور شکتی" کی پوجا کرتے تھے یعنی وہ نیچر کی پیدا اور پرورش کرنے والی قوتوں کا تصور، مرد عورت کی شکل میں کرتے تھے۔ عورت کو وہ "مہاماتا" مانتے تھے جس کے بُت اس طرح بنائے جاتے کہ وہ اپنے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے ہے۔ ایسے بُت ہر جگہ ملتے ہیں۔

یہ دیوی بابل والوں میں ایشتر کہلاتی تھی جس کا خاوند بعل دیوتا تھا۔ مصر والوں میں یہی جوڑا آئسس (دیوی) اور اوسیریز کہلاتا تھا۔ اسی طرح مختلف مقامات پر ان دیوی دیوتاؤں کے مختلف نام تھے۔ جنھیں خوش کرنے کے لئے قربانیاں کی جاتی تھیں اور نذریں چڑھائی جاتی تھیں۔

اس کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ خدا ایک قوت ہے جس کے تین کام ہیں۔ پیدا کرنا۔ پالنا اور مارنا۔ ان تین قوتوں کا تصور تین انسانوں کی شکل میں کیا گیا جن کے نام مختلف اقوام میں یہ تھے :-

	میسوپوٹامیا	ہندوستان	یونان	روم
پیدا کرنے والا	انو	پرہما	زیئس	جوپیٹر
پالنے والا	ای آ	وشنو	پوزیڈان	نیپچون
مارنے والا	بعل	مہیش (یا شیو)	ہیڈس	پلوٹو

میسوپوٹامیا کے لوگ اپنے تینوں دیوتاؤں کو ایک ہی مرتبہ کا مانتے تھے، لیکن یونان اور روم میں زیئس اور جوپیٹر ہی سب کچھ تھے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں میں آفریدگار دیوتا غائب ہو گیا، وشنو اور مہیش (شیو) رہ گئے اور ان میں بھی شیو کے ماننے والوں کی اکثریت ہے۔

پھر ان دیوتاؤں پر اُن کی شکتیوں (بیویوں) کا اضافہ کیا گیا اور اُن کے بچوں وغیرہ کا ہونا بھی ظاہر کیا گیا۔ اس طرح ان دیوی دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے مظاہر فطرت جیسے چاند، سورج اور دریا وغیرہ کے دیوتاؤں نے مل کر ہر قوم میں دیوتاؤں کی ایک خاصی فوج طیار کر دی۔ چنانچہ مصر والوں میں تو اتنے دیوی دیوتا تھے کہ ہمارے لئے اُن میں مذکورہ تریمورتی (برہما۔ وشنو اور مہیش) کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ اور یہی حال ہندوؤں میں ہوا۔ فی الحال پڑھے لکھے ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک ہی ہے جو مختلف قوتوں سے متصف ہے اور چونکہ انسان کسی مجرد قوت کا تصور نہیں کر سکتا لہذا ان قوتوں کے اعتبار سے خدا کو مختلف صورتوں میں دکھایا جاتا ہے جنھیں اوتار روپ ایشور کے مختلف روپ سمجھنا چاہیئے۔

یہودیوں میں جیسا کہ اُن کی مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے خدا کائنات سے الگ تھلگ ایک قوت ہے جس کا تصور انسان کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ اُسے بائبل میں کہیں تو آدم سے باتیں کرتے دکھایا ہے اور کہیں گلگشت کرتے۔ وہ ایک ظالم بادشاہ کی طرح ہے جو انسان کو ذرا ذرا سی بات میں جہنم کی دھمکی دیتا ہے۔ قریب قریب یہی تصور عیسائیوں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔

خدا کا سب سے اعلیٰ تصور ہندوؤں کے اُس فلسفہ میں پایا جاتا ہے جسے "ویدانت" کہتے ہیں۔ اس مذہب کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ خدا مخلوق سے الگ نہیں۔ وہ ہر چیز میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز اس میں ہے۔ اگر وہ ایک سمندر ہے تو ہم اس کے لہریں ہیں۔ انسان کی آتما جب اچھے کرموں سے

انتہائی پاک ہو جائے گی تو پرم آتما میں مل جائے گی اور جب تک آتما، پرم آتما میں نہ ملے گی اُسے بار بار پیدا ہونا پڑے گا۔ اگر بُرے کرم کرے گی تو حیوانوں میں اگر اچھے تو انسانوں میں اُسے پرم آتما تک پہونچنے میں بہت سے جسمانی اور روحانی مدارج طے کرنا پڑیں گے۔ اور جب وہ پرم آتما میں مل جائیگی تو اُسے "نروان" (نجات) حاصل ہو جائے گا — اس کو مسئلہ "آواگون" کہتے ہیں۔ اور یہی عقیدہ بدھ مذہب کے ماننے والوں کا ہے۔

تناسخ کے ماننے والوں میں خدا کا تصور بہت دلچسپ ہے یعنی ان کے یہاں خدا "پرم آنند" یعنی خوشی محض ہے۔ وہ دُنیا کو پیدا کر کے الگ تھلگ ایک سُرور کی حالت میں پڑا ہوا ہے اُسے دُنیا کے جھمیلوں سے کوئی مطلب نہیں۔ اُس نے کائنات کو بنا کر مشین کی طرح چلا دیا ہے اور خود آرام کر رہا ہے گویا اس تصور کے مطابق خدا پہ انسان کی الحاح و زاری کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ حمد و ثنا کا۔ یا بالفاظ دیگر اس مذہب کے ماننے والوں کے نزدیک انسان مختار ہے اور اپنے افعال کا خود ہی ذمہ دار۔

ہندوؤں کا فلسفہ "ویدانت" مسلمانوں کے تصوف کا ماخذ ہے اور اُس کی تعلیمات کسی حد تک چینیوں کے اُس مذہب سے ملتی ہیں جسے "طاؤ ازم" کہتے ہیں جس کی تعلیم یہ ہے کہ "خود انکاری پر عمل کرو اور طاؤ میں واصل اور جذب ہو جاؤ۔ کیونکہ طاؤ ہی دائمی اور غیر فانی راستہ ہے اسپر ہو کر تمام چیزوں اور ہستیوں کو چلنا پڑتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ تمام چیزوں کا سبب اور نتیجہ ہے۔ تمام چیزیں اُس سے پیدا ہوئیں اور اُسی کی مطیع رہتی ہیں اور اُس کی طرف آخر کار مراجعت کرتی ہیں۔ وہ سب چیزوں کا سرچشمہ ہے۔" اس کے بعد اہلِ فارس کو دیکھئے ایران کی مسلم آبادی کو چھوڑ کر وہاں ایک طبقہ "آتش پرست" لوگوں کا ہے۔ یہی لوگ ہندوستان میں پارسی کہلاتے ہیں۔ ان کا پیغمبر زردشت یا زوراستر ہے جس کا زمانہ ۶۰۰ سال قبل مسیح خیال کیا جاتا ہے — یہ لوگ دو خدا کے قایل ہیں اور ساری کائنات کو دو قوتوں کے تابع سمجھتے ہیں۔ خیر اور شر یا نور و تاریکی نیک اور نورانی قوت کا نام "یزداں" اور "اہورا مازدا" ہے اور بد اور تاریک قوت کا نام "اہرمن" ان میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ آخر میں نیکی بدی پر غالب آئے گی — آخر میں ہم نیم مہذب اقوام کا ذکر کریں گے جن میں ایشیا اور یورپ کی کچھ قومیں۔ وسطی اور جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ۔ ملانیشیا۔ مکرونیشیا۔ پالی نیشیا اور شمالی اور جنوبی امریکہ کے پُرانے باشندے شامل ہیں۔ انکے علاوہ اسکیمو قوم کے لوگ جو بحر آرکٹک کے نیچے کے حصہ میں آباد ہیں — ان اقوام میں بہت کم ایسی ہیں جن میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ عموماً وہ دنیا کو نیک اور بد روحوں کا تابع سمجھتی ہیں۔ انسان کے ہر درد اور دکھ کا باعث یہی بد روحیں ہیں جنھیں جادو منتر کے ذریعہ زیر کیا جاتا ہے اور نیک روحوں کی تعریف کر کے بد روحوں کو مغلوب کرنے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ اس مذہب کا اصطلاحی نام "شاماں پرستی" ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مذہب ہے جسے "ٹوٹم ازم" کہتے ہیں۔ یعنی لوگ اپنے آبا و اجداد کا رشتہ شجر، حجر اور حیوانوں سے جوڑتے ہیں جس قبیلہ کا جو "ٹوٹم" ہوتا ہے اُس کی وہ حفاظت کرتا ہے اور اگر مارنے ہی کی ضرورت پڑ جائے تو پہلے اپنی مجبوریوں کا اظہار نہایت ہی موثر الفاظ میں کیا جاتا ہے — یہ آپ کے سوال کا مختصر جواب ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے آپ کو "تاریخ مذاہب" "تاریخ امم قدیمہ" "علم الاقوام" وغیرہ کی کتابیں دیکھنا چاہئیں۔

چند کتابوں کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) (i)

(ii) اردو ترجمہ "نیا و پرانا عہد نامہ" مطبوعہ گریٹ برٹین ۱۹۳۵ء

(۲) "من و یزداں" مصنفہ نیاز فتحپوری

(۳) "مذہب" " "

(۴) Chaldia by Lenaide. Ragozine

(۵) Assyria " " "

(۶) Assyria by A. H. Sayce

(۷) Missionary Travels - Dr. Livingstone

(۸) The ancient Maya by Sylvanus Griswold Morley

(۹) Short History of the World by H. G. Wells

(۱۰) The great monarchies of the ancient Eastern world by George Rawlinson

کائنات کی عظمت

پروفیسر اینشیٹن مشہور ماہر ریاضی داں نے کائنات کی وسعت کا اندازہ یہ کیا ہے کہ اس کا قطر ۸ ارب نوری سال کی مسافت رکھتا ہے۔
بہ الفاظ دیگر یوں سمجھے کہ روشنی جس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے، ۸ ارب سال میں اس قطر کو طے کر سکتی ہے۔
یہ ہے صرف قطر کی وسعت کا اندازہ، لیکن اگر کائنات کے محیط یا پورے دایرہ کو طے کرنا ہو تو روشنی ۵۰ لاکھ ملین (یعنی ۵۰ سنکھ) سال میں اسے طے کر سکے گی۔

آفتاب کا درجۂ حرارت ۵ کرور ہے اور اندازہ کیا گیا ہے کہ آفتاب کی قوتِ حرارت ۴ کرور ۲۵ کرور ٹن فی منٹ کے حساب سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

چاند کا قطر صرف ۲۱۶۳ میل ہے۔ وہ اپنا دورہ زمین کے گرد ۲۷ دن، ۷ گھنٹے ۴۳ منٹ اور ۱۱٫۵ سکنڈ میں ختم کرتا ہے یعنی بہ حساب ۲۳۵۰ میل فی سکنڈ۔

زمین کا قطر ایک قطب سے دوسرے قطب تک ۷۹۲۶٫۲۸ میل ہے اور آفتاب کے گرد اس کا دائرۂ طواف ۹ کرور ۳۰ لاکھ میل کا ہے جسے وہ ۱۰ ½ میل فی سکنڈ کی رفتار سے ۳۶۵ دن، ۶ گھنٹے، ۹ منٹ اور ۹ سکنڈ میں طے کرتی ہے۔

کہکشاں کے قطر کا اندازہ اینشیٹن نے ۲ لاکھ ۵۰ ہزار نوری سال کیا ہے۔ اڈنگٹن کے بیان کے مطابق کہکشاں مجموعہ ہے ۳ کھرب ستاروں کا جس میں بے شمار نظام شمسی پائے جاتے ہیں اور جن کے آفتاب ہمارے آفتاب سے کہیں زیادہ بڑے ہیں لیکن باوجود اس عظمت کے کہکشاں خود معہ اپنے نظامہائے شمسی اور سیاروں کے اپنے محور پر گردش کرتی رہتی ہے اور اس کی ایک گردش ۳ کرور سال میں پوری ہوتی ہے۔
لیکن کہکشاں بھی صرف ایک ہی نہیں ہے۔ ۱۰۰ انچ والی دوربین سے دیکھنے کے بعد پتہ چلا ہے کہ ۲۰ لاکھ کہکشائیں اور ہیں جن کا فاصلہ ہم سے ۲۰ لاکھ نوری سال ہے۔

ہمارے کرۂ زمین کی عمر ۲ ارب سال ہے اور اس میں آثار حیات پیدا ہونے کا زمانہ اب سے ۳۰ کرور سال پہلے ہوا تھا لیکن آدمی کی پیدائش اب سے صرف ۳ لاکھ سال پہلے ہوئی ہے۔

فراست الید

جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

قفس و نشیمن

اب آگے کھیل مقدر کا - آب و دانہ کا
قفس میں خواب تو دیکھا ہے آشیانے کا

یہ انقلاب پسندی بھی جزوِ فطرت تھی
قفس کا ہو کے رہا میں نہ آشیانے کا

قفس میں لا کے اسے، صیاد رکھدے سارے گلشن کو
جوابِ آشیاں تو ہو سکے گا پھر بھی مشکل سے

آسماں کو میرے خالی آشیاں سے کیا غرض
جس جگہ میں ہوں وہاں بجلی گرانا چاہیئے

تھی یہی فصل کہ جب اپنا نشیمن اُجڑا
بڑھ گئی وحشتِ دل اور بہار آنے سے

آشیاں کا ایک اِک تنکا ابھی تو یاد ہے
بھولتا جاؤں گا جو جو دِن گزرتے جائیں گے

قفس صیاد رکھ تو دے ہوائے صحنِ گلشن میں
اجل آئے کہ نیند آئے اسیروں کے مقدر سے

بلا سے قید کر صیاد یہ عقدہ تو حل ہوگا
چمن میں آشیاں سے ہم تھے یا تھا آشیاں ہم سے

چمن کی زمزمہ سنجی چمن کے ساتھ تھی نیرؔ
قفس ہے اب قفس میں بیٹھ کر آہ و فغاں کرلیں

اور تو کیا کہیں ہم پر جو قفس میں گزری
آگیا موسمِ گل یہ بھی سُنا کانوں سے

آشیانے کی کشش کیا روکتی،
آنے والا زیرِ دام آ ہی گیا،

چمن والوں کو یاد آیا تھا میں بھی موسمِ گل میں؟
بتا اے نوگرفتارِ قفس کچھ ذکر تھا میرا؟

کیوں سناتا ہے نشیمن کی کہانی، صیاد!
قید میں ٹوٹ چکے ہیں پرِ پرواز - نہ چھیڑ،

خبر بہار کی آئے گی اور پھر آئے گی
قفس نصیب کہیں ایک سال ہو جائے

پڑے ہیں جو منتشر وہ تنکے اُٹھا اُٹھا کر سجا رہا ہوں
خبر کرے کوئی بجلیوں کو کہ پھر نشیمن بنا رہا ہوں

قیدِ قفس میں ذکرِ نشیمن کروں گا میں
کھلتی نہیں زبان کہ تازہ ہے غم ابھی

چمن تو چھوٹا قفس میں آئے اسی کو اللہ راس لائے
وہاں نشیمن بنا چکے ہم، یہاں نشیمن بنا رہے ہیں

ابھی کے دِن ہوئے اُجڑے ہوئے میرے نشیمن کو
ابھی پہچانتا ہے مجھ کو ہر تنکہ گلستاں کا

نیر اکبر آبادی

نیساںؔ اکبرآبادی :-

موجیں یہ تبسم کی تیرے ہونٹوں پہ جو کھیلا کرتی ہیں
اس دل کے فسردہ عالم میں اک حشر سا برپا کرتی ہیں

کچھ حسن میں تو بھی یکتا ہے تسلیم کیا میں نے لیکن
کچھ میری نگاہیں بھی تیرے جلووں کو سنوارا کرتی ہیں

طوفان میں کشتی آئی بھی اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
اب کیا ہے جو ساحل پر لہریں اُٹھ اُٹھ کے نظارا کرتی ہیں

بیتاب ہے دل جنکی خاطر میں جن کو ترستا رہتا ہوں
مجھ سے بھی چھپا کر میری طرف وہ نظریں دیکھا کرتی ہیں

نیساںؔ یہ کہاں سے دل میں تم اک درد بسا کر لائے ہو
تنہائی میں ٹیسیں اُٹھ اُٹھ کر یہ کس کو پکارا کرتی ہیں

مشیرؔ جھنجھانوی

محبت میں سحر اے دل برائے نام آتی ہے،
یہ وہ منزل ہے جس منزل میں اکثر شام آتی ہے

نہ جانے کیوں دلِ غم آشنا کو دیکھ لیتا ہوں،
جہاں کانوں میں آوازِ شکستِ جام آتی ہے

محبت نے ہر اک سے بے تعلق کر دیا مجھ کو
تمہاری یاد بھی اب تو برائے نام آتی ہے

نہ جانے کون سی منزل میں اب تم جلوہ فرما ہو
نظر رہ رہ کے اُٹھتی ہے مگر ناکام آتی ہے

بدل سکتا ہوں اس کا رُخ مگر یہ سوچکر چپ ہوں
تمہارا نام لیکر گردشِ ایام آتی ہے

رُباعیات

(صفیہ شمیمؔ ملیح آبادی)

اے سینۂ گردوں کے شرارو ٹھہرو
ڈھلتی ہوئی رات کے سہارو ٹھہرو

آنکھوں سے ابھی تو بہ رہے ہیں آنسو،
اے ڈوبتے غمناک ستارو ٹھہرو

ہر لحنِ طرب خنز ہے ماتم گویا،
ہر پھول ہے اک دیدۂ پُرنم گویا

گلشن میں بہار ابکی آئی کیسی
جنت میں بھڑک اُٹھا جہنم گویا

تقدیر گہر جاگ اُٹھی ہے گویا
تنویر قمر جاگ اُٹھی ہے گویا

کھڑکے کی یہ سرخیاں، تبسم کی یہ ضو
جنت میں سحر جاگ اُٹھی ہے گویا

نگار کی پرانی مکمل جلدیں

۳۱ء	۳۲ء	۳۵ء	۳۶ء
۱۵ء	۱۵ء	۱۵ء	۱۵ء
۳۷ء	۴۷ء	۵۰ء	
۱۵ء	۱۰ء	۱۰ء	منیجر نگار

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور انکے تنقیدی مقالات سندی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس
کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، مانا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

مجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اسقدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کا بھولا سبق بھی خود بخود یاد آنے لگتا ہے، اس کو مثل آب حیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے نادرن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹہ کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور رنگ کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اسکے استعمال سے بامراد بنکر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے۔ صبو تحمل نہیں کر سکتے۔ الغرض اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے

قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک چار روپیہ (للعہ)

نوٹ: - فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نقالوں سے ہوشیار رہئے

میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمائیے

پتہ:- **حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام**

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر نمبر ۲ لکھنؤ یو۔پی

جن بچوں کو
بڑا ہو کر دنیا میں اپنی آواز بلند کرنی ہے
ان کی پرورش نونہال پر اوں چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانے والا
ان کا دل پسند ٹانک

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

دی مغل لاین لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازران کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے
پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کرسکیں گے

مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ- بمبئی

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس لمیٹڈ، ۲۔ ایسپلانیڈ روڈ (جنوب)

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مادئین کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانۂ حسن و عشق کی تمام فتنہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے:-

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشار کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے ایران، ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر۔ فارسی زبان کی پیدائش پر مؤخانہ نظر۔ اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصولِ نقد فنونِ ادبیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد ان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

Regd. No. A466

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد دلین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثیل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈسن" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ

جولائی ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے "۵۵ سال کے بعد" یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپنے سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر رنج و الم آپ کیلئے بے معنی ہوجائے گا (۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا (۳) آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائیگا (۴) انحطاط عمر اور ضعیفی کا موجودہ مفہوم قطعی باقی نہ رہے گا۔ (۵) شاہراہ حیات پر چلنے کا وہ طریقہ آپکو معلوم ہوجائیگا جو اسوقت تک آپکی آنکھوں سے اوجھل تھا قیمت ۱۲ عہ

سالنامہ ۱۹۲۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہوچکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول